جہانِ نہاں
سید محمد اطہر شہزاد
جہانِ نہاں

جہانِ نہاں

سید محمد اطہر شہزاد

7 گدلے پانیوں کی ٹراؤٹ اورخوبانی 11 دیومالائی سرزمین کا جادو 15 کمراٹ 18 منی مرگ 23 جھیل کنڈول
26 سلسلہِ ہندوکش کے رنگ 30 اک جہانِ گمشدہ 35 راکاپوشی 40 چٹا کٹھہ

جہانِ نہاں

44 نلتر 47 دودھی پت سر 50 ہُوشے 54 تاؤبٹ 59 شاہراہِ جابجا حیرت 64 دیودار کے جنگلوں میں
82 دنیا کا سب سے کم بلند گلیشیر 86 سیاحوں کو بلندیوں تک پہنچانے والے 92 یٹی کون؟ 96 ہمالیہ کی حسین ترین وادی

گدلے پانیوں کی ٹراؤٹ اور خوبانی

جابجا اونچے درختوں کے درمیان لہلہاتی فصلیں جو اس دریا کے پانی سے ہی سیراب ہوتی ہیں انسان پر وجد کی کیفیت طاری کرنے پر قادر ہیں۔ان مقامات پر جہاں دریا کا پاٹ چوڑا ہو جاتا ہے، ایسی بے مثال جھیلیں وجود میں آتی ہیں جنہیں دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

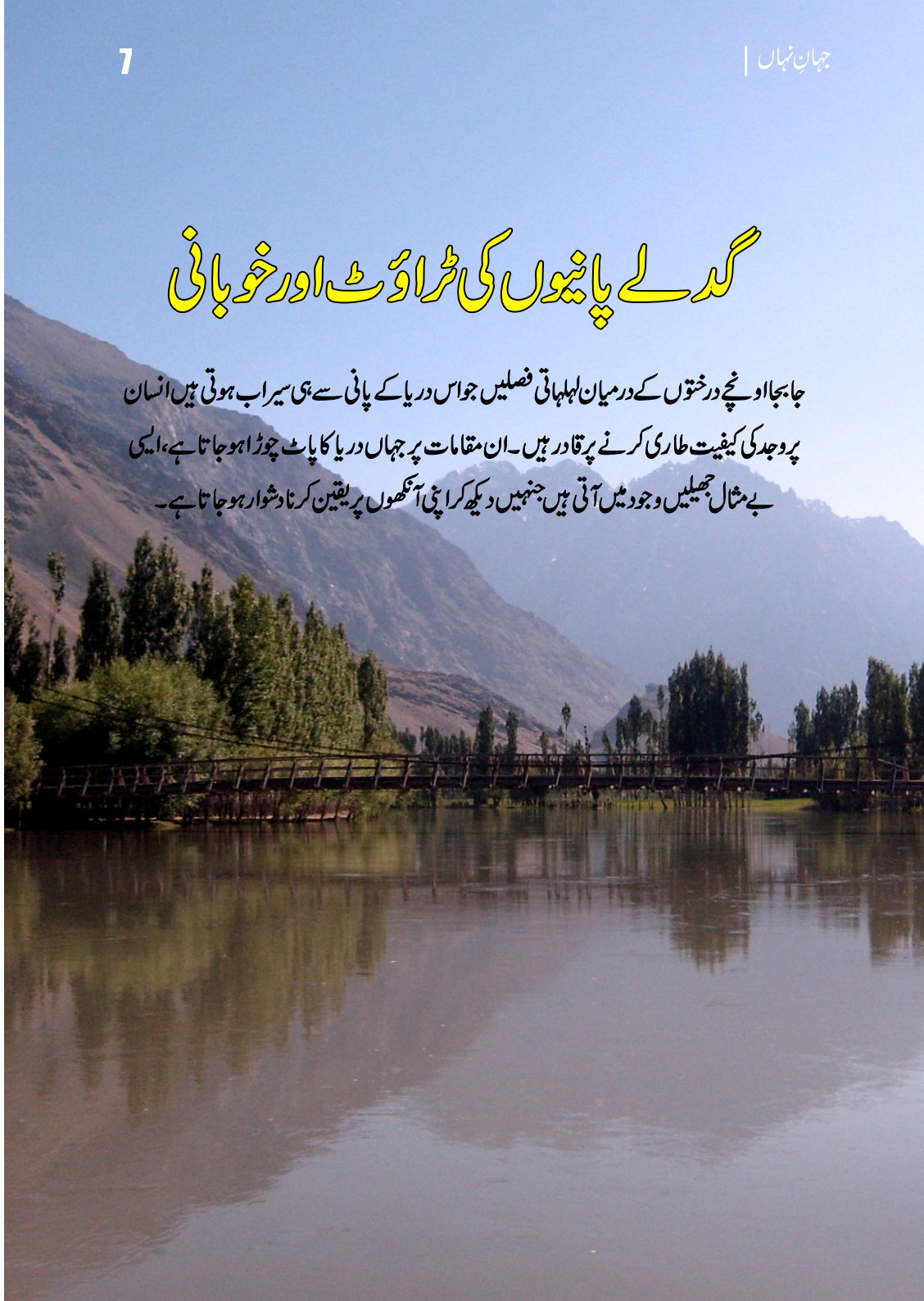

انسانی اور موسمیاتی تبدیلیوں اور ان کے نقصانات کے بارے میں حالیہ عشروں میں جو کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے اس سے دنیا بھر کے لوگوں کے شعور میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ اس شعور سے کما حقہ فائدہ اٹھانے میں کیا رکاوٹیں حائل ہیں۔غریب اور کم تعلیم یافتہ معاشروں میں ابھی کن اقدامات کی ضرورت ہے اور تعلیم یافتہ مہذب معاشروں میں کن تیز رفتار اقدامات کو روکنا ضروری ہے۔لیکن یہ ایک آنکھوں دیکھی حقیقت ہے کہ گلگت بلتستان کی برفیں تیزی سے پگھل اور سمندر کی نذر ہوتی جا رہی ہیں جبکہ سیاح غائب ہیں۔موسموں کی یہ شدت میدانوں سے نکل کر ان وادیوں کو بھی متاثر کر رہی ہے جہاں کے لوگ گرمی کے نام سے بھی نا آشنا ہیں۔ ان بلندیوں کی رنگت بھی شاید سنولا رہی ہے جو اب تک نیلگوں سفید ہیں اور ان سفیدیوں پر سرمئی بادلوں کا سایہ ہے۔

اس حقیقت کی ایک مثال گزشتہ ماہ گلگت کی مشہور وادیوں کی سیاحت کے دوران جابجا دیکھنے کو ملتی رہی۔گرمی کی شدت پاکستان کے میدانی اور جنوبی علاقوں میں تو ہر سال اپنا اثر دکھاتی ہے اور یہاں کے لوگوں کو اس کو عادت بھی پڑ ہی جاتی ہے،لیکن یہ پانچ چھ دن جو گلگت اور اس کے مضافات میں گزرے زیادہ تر موسم اور انسانی رویوں میں تبدیلی کے ان علاقوں پر اثرات کے بارے میں ہی سوچتے گزرے۔

گلگت سے دریائے غذر کے کنارے ایک طویل جیپ کے سفر میں اس دریا کا حجم اور رفتار جب کہ جابجا روکاوٹیں اور تلاشی ہماری توقعات سے کئی گناہ زیادہ تھی۔دریا کے کنارے وہ درخت جو یقیناً دریا کی حدود سے باہر ایک ترتیب سے لگائے گئے تھے کئی کئی فٹ دریا کے اندر دکھائی دیتے تھے۔اس دریا کا سبز پانی جو شدید دھوپ میں بھی ٹھنڈک کی ایک خاص تاثیر رکھتا ہے ابھی بھی سبزی مائل تھا لیکن گدلا رہا تھا۔ پونیال اور گوپس کے ہموار اور نشیبی علاقے مکمل زیر آب تھے۔پھنڈر کے علاقے میں چند مقامات پر تو یہ پانی سڑک سے بھی ٹکراتا تھا۔

مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ گرمی کی شدت کے باعث دریا میں پانی کی اس قدر زیادتی ہے کہ یہ کناروں سے کئی کئی میٹر باہر نکل آیا ہے۔

"آپ ٹراؤٹ مچھلی مانگتے ہو؟ پانی گندا ہو گیا! اس میں مچھلی کا شکار نہیں ہوتا۔کئی گھنٹے بیٹھو تو شاید کوئی دانہ ہاتھ لگ جائے۔وہ لڑکا صبح سے پانی میں کنڈی ڈالتا ہے لیکن مچھلی نہیں آتا۔"

جانے سرد شفاف پانیوں کی عادی اس نادر مچھلی کی جان پر اس ریتلے پانی میں کیا بنی ہوگی؟

غذر کے طویل و عریض علاقے کی خوبصورتی لاجواب ہے۔ بھورے پہاڑوں کے درمیان بہتا سبزی مائل دریا جس سے اٹھتی ٹھنڈی ہوائیں جھلستی دھوپ کی تپش کو بھی زائل کر ڈالتی ہیں۔ اور یہی اس علاقے کی سب سے بڑی خوبصورتی ہے۔ خوبانی، شہتوت، انگور، انجیر اور جانے کیسے کیسے میووں کے جھنڈ ہوا میں بھی اپنی مٹھاس بکھیرتے ہیں۔ جا بجا اونچے درختوں کے درمیان لہلہاتی فصلیں جو اس دریا کے پانی سے ہی سیراب ہوتی ہیں انسان پر وجد کی کیفیت طاری کرنے پر قادر ہیں۔ ان مقامات پر جہاں دریا کا پاٹ چوڑا ہو جاتا ہے، ایسی بے مثال جھیلیں وجود میں آتی ہیں جنہیں دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ کہاں دریا کی وہ تندی جو اس کی طرف دیکھنے سے خوفزدہ کرتی ہے اور کہاں یہ ٹھہراؤ جس کو دیکھ کر کوئی گمان تک نہیں کر سکتا کہ کسی مقام پر اس پانی کا ایک چھینٹا بھی اڑ سکتا ہے۔

وہ جھیلیں جو دریا سے کٹی ہوئی اپنی علیحدہ شناخت قائم رکھے ہوئے ہیں آج بھی نیلگوں ہیں۔ ان جھیلوں میں آج بھی آسمان جھک جھک کر دیکھتا ہے۔ سامنے کے منظر کی تصویر جھیل میں زیادہ صاف نظر آتی ہے۔ گہرائی جتنی بھی ہو جھیل کی تہہ تک نظر کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ زیرِ آب اپنی دنیا میں مگن ٹراؤٹ مچھلیاں ہر آنکھ بآسانی دیکھ سکتی ہے۔ لیکن ذہن میں یہ خیال ضرور آیا کہ یہ پانی بھی کسی برفانی چوٹی سے اترا ہے۔ اگر کبھی ایسا وقت آیا جب برفیں زیادہ پگھلیں تو ریت، گارا اور پتھر پانیوں میں ضرور آئے گا۔ شیشے سے زیادہ شفاف ندیاں گلیشیئر سے نکلتے دریا کی مانند گدلی ہو جائیں گی۔ اور جب یہ پانی ان جھیلوں میں اترے گا تو کیا یہ بھی ایسی ہی ریتلی ہوں گی جیسا کہ دریائے غذر ان گرمیوں میں نظر آتا ہے؟ کیا ان کا پھیلاؤ بھی کچے کناروں کو پہلے زخمی اور پھر ملیامیٹ کرتا رہے گا؟ لہلہاتی فصلوں کی جگہ کٹے پھٹے بے آباد قطعے دلدل کی مانند دکھائی دیا کریں گے؟ نامعلوم صدیوں کے اس طلسم ہوشربا کا حسن گہنا جائے گا؟ ٹراؤٹ مچھلی کے شکار کی کہانیاں ہی باقی رہ جائیں گی؟

یہ ہمارا ہمیشہ کا مشاہدہ ہے کہ بلندیوں سے اترتے نالوں، ندیوں اور دریاؤں کا تیز رفتار اور پھواریں اڑاتا بہاؤ ہمیشہ سے ہی اپنی مثال آپ ہے۔ اور جب یہ چھوٹے بڑے پانی کسی مرکزی دھارے میں شامل ہو چکے ہوں تو یقیناً اس مرکزی دھارے کی گہرائی اور چوڑائی میں اضافے کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ گلگت کے ایسے کئی مرکزی

دریاؤں میں دریائے ہنزہ اور دریائے غذر کا شمار بھی کیا جاتا ہے۔ ان مرکزی دریاؤں میں لاتعداد چھوٹے بڑے ندی نالے شامل ہوتے رہتے ہیں اور بالآخر یہ دریائے سندھ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ دریائے ہنزہ میں چین کی سرحد سے لے کر نگر، ہنزہ اور نلتر وغیرہ کے وسیع و عریض علاقوں کا پانی شامل ہوتا ہے جبکہ دریائے غذر کو ہندوکش اور پامیر کے پہاڑوں سے پگھلنے والا پانی قابلِ دید روانی بخشتا ہے۔ دریائے غذر اپنے سبزی مائل شفاف پانیوں کی وجہ سے شندور تک کے سفر کو آج بھی خوبصورتی کا ایک نیا تصور عطا کرتا ہے۔ غالباً یہ دریا پاکستان میں ٹراؤٹ مچھلی کا سب سے بڑا ذخیرہ بھی ہے۔ اس کے سرد پانیوں میں ٹراؤٹ مچھلی کی افزائش کا ایسا قدرتی انتظام موجود ہے جس کے باعث ایک طویل و عریض علاقے میں کسی بھی جگہ مچھلی کا شکار کیا جا سکتا ہے۔

اب تک تو یہ سب ہے۔ اللہ کا احسان ہم پر ہے۔ سیاح نہیں ہیں لیکن زمین ہماری ہے۔

ڈر صرف یہ لگتا ہے کہ لوگوں اور موسموں میں آتی تبدیلیاں اگر شدت پکڑتی گئیں تو شاید وہ سب جس کو سن کر، پڑھ کر اور تصویروں میں دیکھ کر بھی طبیعت آسودہ ہو جاتی ہے، بھولے ہوئے خواب نا ہو جائیں۔ اپنی طرف کھینچنے والی وادیاں آبادیوں کا رخ کرتے مہاجروں کا پڑاؤ نا بن جائیں۔ زرد خوبانیوں سے لبریز کوئی درخت دریا میں اتنی دور نا چلا جائے کہ پہنچ سے باہر ہو جائے۔ دریا کنارے، ٹراؤٹ کی آس میں وہ لڑکا کہیں پتھر نا ہو جائے۔

دیومالائی سرزمین کا جادو

شوسر جھیل دنیا کی بلند ترین جھیلوں میں سے ہے گہرے نیلے پانی، اپنے پس منظر میں برف پوش پہاڑیوں اور پیش منظر میں سرسبز گھاس اور رنگ برنگے پھولوں کے ساتھ یہ منفرد جھیل خوبصورتی میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔

کیا کوئی جھیل بھی اندھی ہوسکتی ہے؟

جب انسان اپنے علم وفہم کو کسی پیش آنے والی حیرت کے مقابلے میں کم تر پاتا ہے تو ایسے معاملے کو قریب ترین قابل فہم نام دیتا ہے۔ سطح مرتفع دیوسائی میں واقع اس جھیل کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ خود دیوسائی کا نام بھی ایسا ہے کہ جس سے دیومالائی وطلسماتی تاثر فوراً ہی ذہن میں ابھرتا ہے اور ایسے مقام پر ایک اندھی جھیل!

دیوسائی دو الفاظ کا مجموعہ ہے 'دیو' اور 'سائی' یعنی 'دیو کا سایہ'۔

ایک ایسی جگہ جس کے بارے میں صدیوں یہ یقین کیا جاتا رہا کہ یہاں دیوؤں کا سایہ ہے۔ اس کہ علاوہ سال کے آٹھ ماہ برف سے اٹا یہ علاقہ دنیا کے خوفناک اور منفرد ترین جنگلی حیات سے معمور ہونے کی وجہ سے انسان کے لئے ناقابل عبور رہا۔ برفانی اور یخ بستہ ہواؤں، طوفانوں اور خوفناک جنگلی جانوروں کی موجودگی میں یہاں زندگی گزارنے کا تصور تو اس ترقی یافتہ دور میں بھی ممکن نہیں۔ اسی لئے آج تک اس خطے میں کوئی بھی انسان آباد نہیں۔

کشمیر سے ملحقہ اور کوہ ہمالیہ میں واقع دیوسائی دنیا کا سب سے بلند اور اپنی نوعیت کا واحد سطح مرتفع ہے جو اپنے کسی بھی مقام پر 4000 میٹر سے کم بلند نہیں۔ گرمیوں کے چار مہینوں میں ہزار ہا رنگ کے پھولوں سے سجا ہونے کو باوجود تقریباً 3000 مربع کلومیٹر وسیع وعریض اونچے نیچے ڈھلوانی وہموار سرسبز میدانوں کی اس سرزمین میں ایک بھی درخت نہیں! شفاف پانیوں کے پانچ بڑے دریاؤں، ان گنت ندیوں اور رواں چشموں کا جال لئے کچھ فاصلے پر 5000 میٹر تک بلند پہاڑیوں پر سفید برف جو کہ گرمیوں میں کم ہو کر سبز اور سفید رنگوں کا نہایت خوش نما منظر پیش کرتی ہے اور دیکھنے والوں کے دل ودماغ پر انمٹ نقوش ثبت کرتی ہے۔

گہرے نیلے رنگ کی شوسر جھیل جو انتہائی سرد پانی کا ایک ذخیرہ ہے آج تک ایک عجوبہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس جھیل کا یہ راز نہیں سمجھا جا سکا کہ دیگر تمام جھیلوں کے برعکس اس جھیل کا پانی آتا کہاں سے ہے اور اسکا اخراج بھی کوئی نہیں۔ اسی وجہ سے اسے شوسر یعنی اندھی جھیل کہا جاتا ہے۔ شوسر جھیل دنیا کی بلند ترین جھیلوں میں سے ہے گہرے نیلے پانی، اپنے پس منظر میں برف پوش پہاڑیوں اور پیش منظر میں سرسبز گھاس اور رنگ برنگے پھولوں کے ساتھ یہ منفرد جھیل خوبصورتی میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ شوسر جھیل کے گرد چکر لگانے کے لئے کئی گھنٹے درکار ہیں جس سے اس کے طول وعرض کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

دیوسائی اور شوسر جھیل سیاحوں کی پہنچ میں دو اطراف سے ہے: ایک سکردو کی طرف سے شمالی سمت سے اور دوسرا استور سے مغربی سمت سے۔ سیاح اپنی ہمت اور شوق کے مطابق کئی طریقوں سے دیوسائی کی سیر کرتے ہیں۔ عام طور پر جیپ سفاری، گھوڑوں کے ذریعے یا پھر جسمانی طور پر مضبوط سیاح پیدل بھی دیوسائی تک پہنچتے اور پھر دوسری طرف سکردو یا استور تک جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں دیوسائی بائیسکل سفاری بھی ان دنوں دنیا بھر کی ٹورسٹ کمپنیوں کے لئے سیاحوں کو متوجہ کرنے کا متاثر کن حربہ بن چکا ہے۔ دیوسائی کا سفر چاہے جس سمت سے بھی ہو اور کسی بھی طریقے سے کیا جائے، قدرت کی لامحدود خوبصورتیاں تمام سفر آپ کے ہم رقاب ہوتی ہیں۔

دیوسائی کے لئے بھی شمالی علاقہ جات کے دیگر تمام بلند پہاڑی مقامات کی طرح مکمل تیاری اور منصوبہ بندی سفر کی پہلی شرط ہے۔ اپنے اچانک شدید طوفانوں، سرد موسم، مچھروں کی یلغار، خوراک و دیگر ساماں حتیٰ کہ انسانی آبادی کے آثار سے بھی تہی اس علاقے کی سیاحت آپ سے گھر سے نکلنے سے پہلے مکمل معلومات اور زادِ راہ کا مناسب انتظام مانگتی ہے۔

سکردو کی طرف سے سفر مشہور جھیل صد پارہ سے ہوتا ہوا غیر ہموار کچے راستے اور مسلسل چڑھائی پر مشتمل ہے۔ ایک طرف نہایت اونچے پہاڑوں اور راستے کے دوسرے سرے پر گہری کھائیوں کی موجودگی۔ تنگ موڑوں کے اس راستے پر نہایت ماہر اور تجربہ کار ڈرائیور کے علاوہ جیپ چلانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

علی ملک کے مقام پر جو کہ دیوسائی میں داخل ہونے کا نشان ہے اور ایک بلند پہاڑی درہ ہے سے گزر کر آپ دیوسائی کی سرزمین میں قدم رکھتے ہیں۔ یہاں سے وہ کرشماتی حسن جو دنیا بھر کے سیاحوں کو اپنی طرف بلاتا ہے آپ کو بھی اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ شتوں کے پانی سے جو کہ گھٹنوں سے لیکر کمر تک اونچے پانی کا ایک چوڑا دریا ہے، آپ کو پانی میں سے ہی گزرنا ہوتا ہے۔ اگر آپ جیپ میں ہیں تو کوئی مشکل نہیں لیکن پیدل سفر کرنے والوں کے لئے یہ ایک امتحان ہوتا ہے۔ نہایت سرد تیز رفتار پانی میں سے سامان اٹھا کر گزرنے کے بعد اکثر سیاح کافی دیر تک اپنے حواس ہی بحال کرتے رہتے ہیں۔

اگلا مقام بڑا پانی ہے جہاں اکثر سیاح اپنے خیموں میں رات گزارتے ہیں۔ یہاں محکمہ تحفظ جنگلی حیات کے خیمے بھی سارا سیزن لگے رہتے ہیں جہاں اہلکار جنگلی حیات کی افزائش و حفاظت کے علاوہ سیاحوں کی رہنمائی اور

سہولیات کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

یہاں سے اگلا پڑاؤ شوسر جھیل کا ہوتا ہے۔ دیوسائی کے سینے سے گزرتے ہر طرف سیٹیاں بجاتے سنہرے خرگوش نما مارموٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے جنگلی یاک اور دیگر حیوانات کا مشاہدہ کرتے جب آپ شوسر جھیل کو پہلی نظر دیکھتے ہیں تو پھر یہ جھیل آپ کی توجہ کسی اور جانب مبذول ہونے ہی نہیں دیتی۔ دیوسائی میں اڑتے بادلوں اور بدلتی روشنیوں میں یہ جھیل بھی آپ کو رنگ بدلتی دکھائی دیتی ہے۔ اکثر اوقات رنگ برنگے خیمے دور سے سیاحوں کی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں اور دیوسائی کے سبزہ زاروں میں موجود مختلف قومیتوں، زبانوں اور رنگوں کے یہ لوگ اس جھیل کی خوبصورتی اور انفرادیت پر مکمل متفق نظر آتے ہیں۔

ہمالیائی بھورے ریچھ!

دنیا بھر میں اپنی انفرادی حیثیت کی وجہ سے مشہور وہ ہمہ خور جانور ہے جو دیوسائی کے میدانوں میں صرف 25 سے 30 کی تعداد میں باقی ہے۔ یہ ریچھ نہایت بیدردی سے شکار کئے جانے کی رجہ سے دنیا سے ناپید ہوتے جا رہے ہیں اور اس خطے میں تو دیوسائی کے علاوہ کسی بھی جگہ پر ان کا وجود باقی نہیں۔ انتہائی خونخوار یہ ریچھ اپنی اس سرزمین پر انسان کا وجود پسند نہیں کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ دیوسائی میں دریاؤں پر بنائے جانے والے لکڑی کی پلوں کو ان ریچھوں نے اپنے دانتوں اور پنجوں سے کاٹ کر گرا بھی ڈالا۔ اب بھی بعض پلوں پر لکڑی کے شہتیروں پر ان پنجوں اور دانتوں کی نشانات دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ایسے واقعات کے سبب چند سال قبل پاکستان اور دنیا بھر کے تحفظِ جنگلی حیات کے اداروں نے ان ریچھوں کو پرورش اور حفاظت کے لئے ایک مخصوص علاقے تک محدود کر دیا ہے۔ اب صرف خصوصی طور پر محکمہ تحفظ جنگلی حیات کے گائیڈز کے ساتھ ریچھوں کو ان کے مخصوص علاقوں میں جا کر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ گائیڈز ہر لحاظ سے تربیت یافتہ ہیں اور اس بات کا بھرپور خیال رکھتے ہیں کہ سیاحوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ریچھوں کے معمولات میں بھی مخل نہ ہوں۔ بھورے ہمالیائی ریچھوں کے علاوہ دیوسائی برفانی چیتوں، آئی بیکس، سنہرے مارموٹ، سرخ لومڑی، لداخی اڑیال، ہمالیائی ہرن، بھیڑیوں، مچھلیوں اور دلفریب رنگوں کے انواع و اقسام کے پرندوں کا مرکز ہے۔

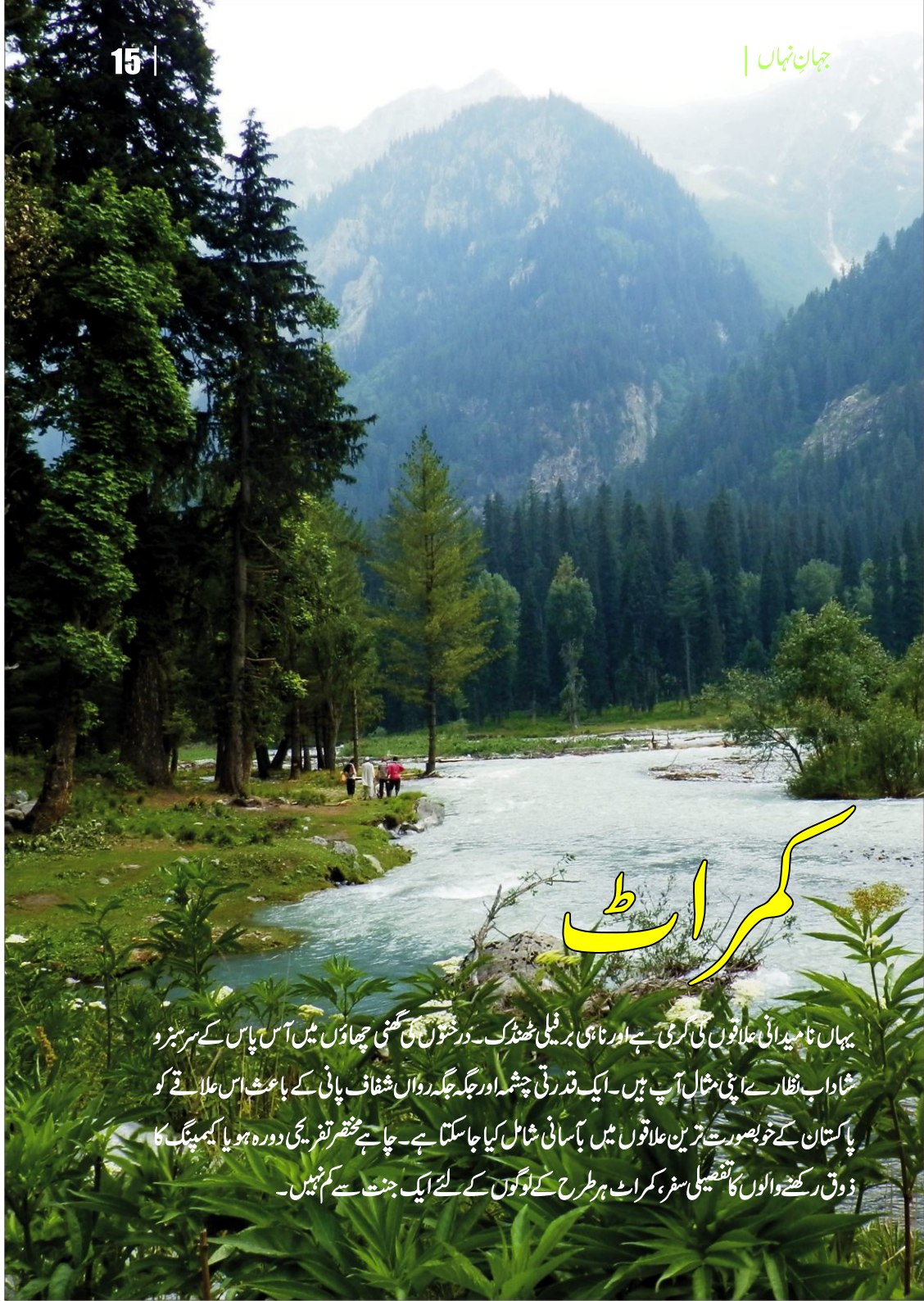

کمراٹ

یہاں نامیدانی علاقوں کی گرمی ہے اور نا ہی برفیلی ٹھنڈک۔ درختوں کی گھنی چھاؤں میں آس پاس کے سرسبز و شاداب نظارے اپنی مثال آپ ہیں۔ ایک قدرتی چشمہ اور جگہ جگہ رواں شفاف پانی کے باعث اس علاقے کو پاکستان کے خوبصورت ترین علاقوں میں بآسانی شامل کیا جاسکتا ہے۔ چاہے مختصر تفریحی دورہ ہو یا کیمپنگ کا ذوق رکھنے والوں کا تفصیلی سفر، کمراٹ ہر طرح کے لوگوں کے لئے ایک جنت سے کم نہیں۔

یوں تو خیبر پختون خواہ کے تمام ہی پہاڑی علاقے کسی نا کسی انوکھی خاصیت کے حامل ہیں۔ کہیں جھیلوں میں گردو پیش کا عکس مسحور کرتا ہے تو کہیں دریاؤں کی پرسکون ٹھنڈک گرم دنوں میں اپنی تاثیر یاد کرواتی ہے۔ کہیں سبزہ و شادابی خوابناک یادوں کا سبب بنتی ہے اور کبھی برف پوش بلندیاں اپنی طرف بلاتی ہیں۔ انسان تجسس کرے تو قدرتی حسن و جمال کا ایک سے ایک بڑھ کر کرشمہ ان پہاڑی سلسلوں کے نشیب و فراز میں موجود ہے۔ انہی فطری مناظر سے بھرپور، عام نگاہوں سے اوجھل، ہجوم اور شور سے دور ایک وادی کمراٹ بھی ہے۔

کمراٹ دیر کوہستان میں واقع ہے۔ دیر بالا سے لگ بھگ پانچ گھنٹے کی مسافت پر واقع تحصیل شرنگل کا تھل نامی گاؤں کمراٹ کا دروازہ ہے۔ دریائے پنجکوڑہ کا سرد اور تیز بہاؤ شدید گرمی میں بھی تمام علاقے کو بے قیمت اور فرحت انگیز ٹھنڈت فراہم کرتا ہے۔ چاروں طرف واقع سرسبز پہاڑوں کے بیچ، سبزی مائل دریا کے کنارے ایک پرسکون قصبہ جہاں کے لوگوں میں اب بھی وہ سادگی اور اخلاص ہے جو دورِ موجودہ میں ایک خیال کی صورت میں ہی باقی رہ گیا ہے۔

تھل سے دریا کے ساتھ ساتھ کچھ پختہ اور بیشتر کچا راستہ ایک ایسی وادی کی طرف راہنمائی کرتا ہے جہاں صرف اور صرف سکون ہے۔ دیار کے گھنے درختوں میں سے ہوتے ہوئے، دونوں اطراف کے گھنے جنگل سے گھرے پہاڑوں کے سائے میں یہ سفر ایک منفرد تاثیر رکھتا ہے۔ سفر کی طوالت اور ناہموار راستے کے سبب اس پوشیدہ حسن تک پہنچنے کے لئے جیپ ہی بہتر انتخاب ہے۔ تھل کی آبادی سے نکلتے ہی دریا کے کنارے کئی مقامات ایک راحت افزا پڑاؤ بن سکتے ہیں۔ دریائے پنجکوڑہ میں ٹراؤٹ مچھلی کی بہتات ہے لیکن اس برفیلے اور تندرفتار پانی میں مچھلی کا شکار نہایت مشکل ہے۔ بغیر مقامی تجربہ کاروں کی مدد کے یہ کام بہت خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔

کمراٹ کا موسم نہایت معتدل ہے۔ یہاں نا میدانی علاقوں کی گرمی ہے اور نا ہی برفیلی ٹھنڈک۔ درختوں کی گھنی چھاؤں میں آس پاس کے سرسبز و شاداب نظارے اپنی مثال آپ ہیں۔ ایک قدرتی چشمہ اور جگہ جگہ رواں شفاف پانی کے باعث اس علاقے کو پاکستان کے خوبصورت ترین علاقوں میں بآسانی شامل کیا جاسکتا ہے۔ چاہے مختصر تفریحی دورہ ہو یا کیمپنگ کا ذوق رکھنے والوں کا تفصیلی سفر، کمراٹ ہر طرح کے لوگوں کے لئے ایک جنت سے کم نہیں۔ کمراٹ کے اردگرد موجود بڑی آبشاریں بھی اس کی انفرادیت کو چار چاند لگاتی ہیں۔ ان آبشاروں تک پہنچنے

کے لئے دریا پار کر کے کچھ بلندی تک چلنا پڑتا ہے۔لیکن کمراٹ جا کر ان آبشاروں کا قریب سے مشاہدہ نا کرنا بدذوقی ہی کہی جاسکتی ہے۔

پاکستان کے دیگر پہاڑی مقامات مثلاً سوات، کاغان، مری اور گلیات کی نسبت کمراٹ کا سفر کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔حتیٰ کہ بہت سے لوگ اس نام تک سے واقف نہیں۔اس کی ایک وجہ دیر کے نہایت دور دراز علاقے میں واقع ہونا بھی ہے۔اس کے علاوہ سفری سہولیات کا میسر نا ہونا اور رہائش کی عدم دستیابی وہ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے یہ علاقہ وہ شہرت بھی حاصل نا کر سکا جو اس سے کہیں کم خوبصورت علاقوں کو حاصل ہے۔

تھل اور کمراٹ کے آس پاس کے تمام علاقوں کے لوگ مہمان نواز اور پرخلوص ہیں۔ مذہبی رجحان اور مقامی روایات کے حامل اہل تھل مہمان نوازی کو بنیادی اخلاقیات میں سرفہرست سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ مہمانوں کی راہنمائی کے لئے اپنے کاروبار اور کام کاج تک کی پرواہ نہیں کرتے۔اس پر مستزاد یہ کہ اس طرح کی کسی بھی خدمت کے عوض معاوضے کی پیشکش کو بھی قبول نہیں کرتے۔

کمراٹ کے لئے ایک راستہ ضلع سوات سے بھی ممکن ہے۔کالام اور اتروڑ سے ہوتا ہوا یہ راستہ ایک دشوار، نہایت بلند لیکن انتہائی گھنے جنگلات میں سے گزرتا ہے۔اس راستے سے کمراٹ کا سفر اپنی نوعیت کا انتہائی منفرد سفر ہے۔ اس سفر کے لئے چھوٹی جیپ اور چاک و چوبند ڈرائیور کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔تنگ موڑوں اور مکمل کچے راستے پر مشتمل اس سفر میں شاید ہی کسی جگہ سورج کی کرنیں زمین تک پہنچتی ہوں۔ایک بلند درہ، سوات اور دیر کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا ہے۔اس درے سے دور دور تک کے پہاڑوں اور سرسبز ڈھلوانوں کا منظر بھی دیکھنے کے لائق ہے۔

کمراٹ کے جنگلات جنگلی حیات سے بھی بھرپور ہیں۔ یہاں مارخور، ہرن اور چیتے وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ بندر تو عام طور پر آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔اگر تجربہ کار مقامی شکاری میسر ہو تو ٹراؤٹ مچھلی بھی بآسانی شکار کی جاسکتی ہے۔کسی بھی قسم کی آبادی نا ہونے کی وجہ سے کمراٹ میں ضروری اشیاء ساتھ لانا ضروری ہے۔تھل کے بازار سے خوراک وغیرہ دستیاب ہے جو ضرورت کے مطابق ساتھ لائی جاسکتی ہے۔

مِنی مرگ

مقام کے انتخاب اور اعلیٰ انتظامات کی بدولت اس جھیل نے حقیقتاً دو میل کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔
شفاف سبزی مائل پانی، جھیل میں گرتا دلفریب جھرنا اور پانی میں تیرتی خوبصورت چوبی نشست گاہ
اس جھیل کو حیران کن حد تک حسین بناتی ہے۔

صوبہ گلگت بلتستان کا ضلع استور کئی خصوصیات کی وجہ سے سیاحوں کے لئے باعث کشش ہے۔ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے میں آباد یہ علاقہ پاکستان کے دوسرے بلند ترین پہاڑ نانگا پربت کی دوسری طرف واقع ہے۔ استور ایک طرف سے آزاد کشمیر، دوسری طرف سکردو سے دیوسائی کے ذریعے ملا ہوا ہے اور تیسری طرف گلگت کا طویل و عریض علاقہ ہے۔ استور ایک فراخ وادی کی صورت میں خشک بھورے پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے۔ اس کی بلندیوں پر جائیں تو گھنے جنگلات، جھیلیں، برف پوش چوٹیاں اور یخ بستہ پانی کی ندیاں ہیں۔ انہی سرسبز اور آنکھوں کو تراوٹ بخشنے والی وادیوں میں سے ایک وادی کا نام منی مرگ ہے۔

منی مرگ لائن آف کنٹرول کے پاس ہونے کی وجہ سے ممنوعہ علاقہ ہے اور صرف باقاعدہ اجازت نامہ حاصل کر کے ہی یہاں جایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ حفاظتی ضروریات کے تحت منی مرگ اور دیگر ممنوعہ علاقوں میں کیمپنگ وغیرہ کی اجازت بھی نہیں ہے۔ حتمی معلومات اور اجازت کے لئے گلگت میں ایف سی این اے کے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

استور سے چھیاسی کلومیٹر کے فاصلے واقع اس حسین وادی تک صرف جیپ کے ذریعے ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ گریکوٹ، چلم اور اکتالیس سو میٹر بلند درہ بُرزل سے ہوتے ہوئے منی مرگ تک تمام سفر دلچسپ مناظر پر مشتمل ہے۔ چلم سے ایک راستہ دیوسائی اور سکردو کی طرف جبکہ دوسرا راستہ منی مرگ کی طرف جاتا ہے۔ چلم چوکی پر شناختی کاروائی وغیرہ کے بعد منی مرگ کا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ برزل اپنی بلندی کی وجہ سے سال کے بیشتر مہینے برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ برف پگھلنے کے بعد درے کے دونوں طرف اور دور دور تک کی ڈھلوانوں کی شادابی اور سبزہ اپنے بھرپور جوبن پر آجاتا ہے۔ درہ پار کرنے کے بعد مسلسل اترائی ہے اور پختہ سڑک ہونے کی وجہ سے جیپ کا سفر خاصی رفتار سے طے ہوتا ہے۔

منی مرگ گاؤں اور آس پاس کی تمام آبادیوں کے مکان مکمل لکڑی سے تعمیر کئے جانے کی وجہ سے منفرد نظر آتے ہیں۔ ان مکانوں کی اطراف میں کھیت اور گاؤں کے اردگرد بلند پہاڑیاں ہیں۔ یہ پہاڑیاں کہیں خشک، کہیں سرسبز اور کہیں درختوں سے پر ہیں۔ دور دور تک ہموار کھیت اور بائیں جانب کی سبزہ زار ڈھلوانیں منی مرگ کی خوبصورتی کا بنیادی سبب ہیں۔ ان ڈھلوانوں کے نیچے تیز رفتار ندی ہے جس میں نیلگوں پانی رواں دواں ہے۔

منی مرگ میں کھانے پینے کے لئے روایتی انداز کا ایک ہوٹل موجود ہے جہاں لکڑی کا ایک تخت مہمانوں کے آرام اور کھانے کے لئے بچھایا گیا ہے۔ ہوٹل کے دائیں اور بائیں گاؤں کی ضروریات کے پیش نظر اکا دکا دکانیں بھی موجود ہیں۔

منی مرگ سے آس پاس کے دیگر خوبصورت علاقوں مثلاً دومیل، چھوٹا دیوسائی اور گلتری وغیرہ تک بھی جایا جاسکتا ہے۔ ان علاقوں میں خاص طور پر قابل ذکر دومیل ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دومیل کی وجہ سے ہی منی مرگ کی شہرت ہے۔ دومیل منی مرگ سے گیارہ کلومیٹر دور ہے۔ اس علاقے کی اصل خوبصورتی دومیل کے جنگلات، گاؤں کے مکانات، سبزہ زار اور رین بوجھیل ہیں۔

رین بوجھیل کو دومیل کا سب سے اہم اور حسین ترین مقام کہا جاسکتا ہے۔ یہ جھیل مصنوعی طور پر بنائی گئی ہے۔ مقام کے انتخاب اور اعلیٰ انتظامات کی بدولت اس جھیل نے حقیقتاً دومیل کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ شفاف سبزی مائل پانی جھیل میں گرتا دلفریب جھرنا اور پانی میں تیرتی خوبصورت چوبی نشست گاہ اس جھیل کو حیران کن حد تک حسین بناتی ہے۔ رنگارنگ پھولوں اور سبز گھاس سے مزین کناروں اور پہاڑی ڈھلوانوں پر درختوں کی قطاریں! خوبصورتی کے ہر پیمانے پر پوری اترنے والی یہ جھیل قدرتی اور انسانی کمالات کا حسین ترین امتزاج ہے۔

منی مرگ سے دومیل تک اور اردگرد کا تمام علاقہ چونکہ سرسبز اور شاداب ہے اس لئے جگہ جگہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ ان سبزہ گاہوں میں چرتے نظر آتے ہیں۔ قدرتی مناظر کے درمیان چرتے اور اٹھکیلیاں کرتے یہ جانور منظر کو اور بھی دلچسپ بناتے ہیں۔

دومیل کا بیشتر علاقہ ایک گھنے جنگل پر مشتمل ہونے کی وجہ سے انتہائی دلفریب ہے۔ ان جنگلات کے بیچ لکڑی کے مکانوں پر مشتمل گاؤں پاکستان کے کسی بھی علاقے کے دیہات سے قطعی مختلف نظر آتے ہیں۔ قریب قریب بنے ان اونچے نیچے گھروں کی ترچھی چھتیں دور سے کسی تصوراتی دنیا کی تصویر نظر آتی ہیں۔ ہرے بھرے میدان میں اور خوبصورت پہاڑیوں کے درمیان ایک ایسا گاؤں جہاں صرف امن اور سادگی ہے۔ آلودگی اور آلائشوں سے دور ایک قابل رشک زندگی کے لئے دومیل کے یہ گاؤں بہترین خواہش ہو سکتے ہیں۔

ممنوعہ علاقہ ہونے اور لائن آف کنٹرول کی قربت کے باعث یہاں سیاحوں کی آمد و رفت نا ہونے کے برابر ہے۔

حفاظتی انتظامات اور جغرافیائی حساسیت کے باوجود اگر اس علاقے کو سیاحت کے لئے پیش کیا جا سکے تو پاکستان کے خوبصورت سیاحتی ورثے میں یہ سب سے اہم اضافہ ہوگا۔ پاکستانی نوجوانوں میں مثبت سرگرمیوں کے فروغ اور سیاحت کی صنعت کی ترقی کے لئے ایسا کوئی بھی قدم یقیناً قابل ستائش قرار پائے گا۔

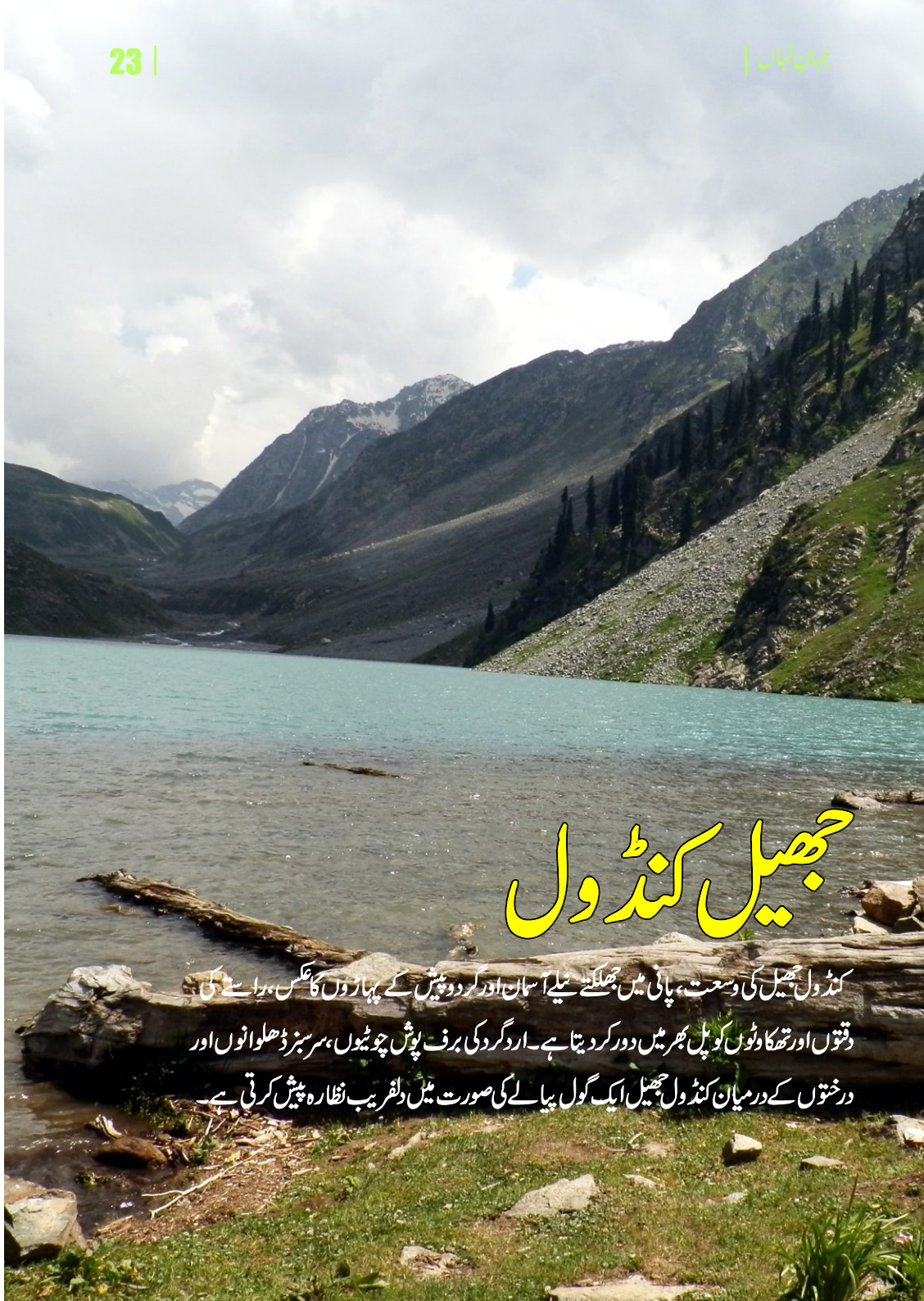

جھیل کنڈول

کنڈول جھیل کی وسعت، پانی میں جھلکتے نیلے آسمان اور گردوپیش کے پہاڑوں کا عکس، راستے کی دقتوں اور تھکاوٹوں کو پل بھر میں دور کر دیتا ہے۔ اردگرد کی برف پوش چوٹیوں، سرسبز ڈھلوانوں اور درختوں کے درمیان کنڈول جھیل ایک گول پیالے کی صورت میں دلفریب نظارہ پیش کرتی ہے۔

کنڈول جھیل پاکستان کی بلندیوں میں واقع ان بڑی جھیلوں میں سے ایک ہے جو دیکھنے کے لئے آنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتیں۔ نیلے پانیوں، چاروں طرف کے اونچے پہاڑوں کے عکس اور دلچسپیوں سے بھرپور سفر کی بدولت جھیلوں کے شائقین کے لئے یہاں ہر طرح کی کشش موجود ہے۔ اپنی تمام تر رعنائیوں اور کالام جیسے پررونق مقام سے قربت کے باوجود اس جھیل کو دیکھنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں۔ بلندی، مسلسل چڑھائی اور کم معروف ہونے کی وجہ سے سوات کا سفر کرنے والے اکثر سیاح اس جھیل کے نام اور محل وقوع سے بھی واقف نہیں۔

سوات کے مشہور ترین مقام کالام سے کوئی ایک گھنٹہ جیپ کے ذریعے اتروڑ کی حسین وادی اس جھیل تک رسائی کی پہلی منزل ہے۔ وادی اتروڑ ایک نہایت خوبصورت وادی ہے جس کے اطراف میں جنگلات سے بھرپور پہاڑ ہیں۔ ایک پرشور، یخ بستہ اور صاف پانی کا دریا وادی میں، جب کہ متعدد جھیلیں ان پہاڑوں کی بلندیوں پر واقع ہیں۔ ان جھیلوں میں کنڈول اور لدو کا نام قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ دسان کی خوبصورت سرسبز و شاداب ڈھلوانیں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ اتروڑ کی پہاڑیاں کالام کی نسبت کہیں زیادہ سرسبز اور درختوں سے لبریز ہیں۔ کالام کی نسبت کم پرہجوم ہونے کی وجہ سے اتروڑ میں سکون اور سکوت کا احساس ہوتا ہے۔

اتروڑ بازار سے دریا کے ساتھ ساتھ ایک تنگ لیکن پختہ سڑک پر کنڈول کی طرف سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ سڑک دریا پر بنائے گئے ایک پل سے ہوتی ہوئی دسان کی طرف جاتی ہے۔ پل پار کرتے ہی ایک تباہ شدہ ہوٹل ہے۔ یہاں سے ایک کشادہ راستہ دسان کی طرف جاتا ہے جبکہ کنڈول جھیل کے لئے دریا کے متوازی ریت اور پتھروں کا نظر نا آنے والا راستہ ہے۔ دریا کے بائیں کنارے پتھروں پر چلتے ہوئے کچھ ہی دیر میں درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ درختوں کے اس سلسلے سے باہر نکلیں تو اتروڑ کا آخری عارضی گاؤں ہے۔ یہ پاکستان کے چند حسین ترین دیہات میں سے ایک ہے۔ آلوؤں کے وسیع کھیتوں، اور اطراف کے سرسبز پہاڑوں کے درمیان اس گاؤں میں انتہا کا سکون ہے۔ ایک فراخ وادی میں کھیتوں کے درمیان ایک تنگ کچے راستے سے گزرتے ہوئے گاؤں کے اختتام تک یہ ایک آسان سفر ہے۔ گاؤں کے اختتام پر گرمیوں کے وسط تک ایک مختصر سا گلیشئر موجود رہتا ہے۔ یہ گلیشئر بلند پہاڑوں سے آنے والے ایک نہایت تیز رفتار نالے کو بھی ڈھانپے رکھتا ہے۔ احتیاط کے ساتھ اس گلیشئر پر سے اس نالے کو پار کر کے ایک بلند اور تنگ پگڈنڈی کنڈول جھیل کے راستے کا نشان ہے۔

اس تنگ پگڈنڈی پر بلندی کا یہ سفر مستقل مزاجی اور تندرستی دونوں کا امتحان ہے۔ دھوپ کی شدت سے بچنے کے لئے صبح کے ابتدائی گھنٹوں میں یہ سفر بہت سا وقت اور طاقت بچا سکتا ہے۔ آغاز کے مشکل سفر کے بعد گھنے درختوں کا ایک سلسلہ اس سفر کو کافی حد تک آسان بنا دیتا ہے۔ سبزے کی بہتات کی وجہ سے راستے پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ جھاڑیوں، درختوں اور گھنی گھاس کے باعث بہت سے مقامات پر درست راستے پر قائم رہنا مشکل کام ہے۔ لیکن راستہ کھونا اور پھر درست راستے کو پانا اس گھنے جنگل میں کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اس مسلسل چڑھائی کا اختتام اچانک ہی ہوتا ہے اور ایک گہری کھائی سامنے آجاتی ہے۔ اس کھائی میں پانی کا نالہ کافی گہرائی میں نظر آتا ہے۔ یہ کھائی جھیل کو پہنچنے کے لئے آخری امتحان ہے۔ کھائی کے دوسری طرف طویل ٹیلے نما بلندی میں کنڈول جھیل واقع ہے۔ دائیں سمت بلندی کی طرف برف کا ایک اور گلیشیر اس کھائی اور نالے کو ڈھانپے ہوئے نظر آتا ہے۔ یہی گلیشیر اس کھائی کو پار کرنے کا آسان ترین ذریعہ ہے۔ اس گلیشیر تک پہنچنے کے لئے دائیں ہاتھ پر بلندی کی سمت ایک پتھریلا میدان نما علاقہ ہے۔ میدان کے اختتام پر گلیشئر کا آغاز ہے اور چند منٹ کی جدوجہد کے بعد کنڈول جھیل اچانک نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

کنڈول جھیل کی وسعت، پانی میں جھلکتے نیلے آسمان اور گرد و پیش کے پہاڑوں کا عکس، راستے کی دقتوں اور تھکاوٹوں کو پل بھر میں دور کر دیتا ہے۔ اردگرد کی برف پوش چوٹیوں، سرسبز ڈھلوانوں اور درختوں کے درمیان کنڈول جھیل ایک گول پیالے کی صورت میں دلفریب نظارہ پیش کرتی ہے۔ ماحول کے سکوت اور ٹھنڈی ہوا میں جھیل کے کنارے وقت گزارنا یقیناً ان پر راحت لمحوں میں تبدیل ہو جاتا ہے جو میدانوں کی گرمی اور شہروں کے شور شرابے میں بھی اپنی یاد دلاتے ہیں۔ اگرچہ جھیل کے کنارے ایک کچا اور عارضی سا کمرہ موجود ہے جو شاید چائے خانے وغیرہ کے لئے بنایا گیا ہو۔ لیکن اکثر غیر آباد ہونے کی وجہ سے یہ ضروری ہے کے قیام و طعام کی تمام لوازمات اپنے ہمراہ لے جائی جائیں۔ ڈھائی سے چار گھنٹے کے اس مشقت طلب پیدل سفر کے بعد بھوک اور پیاس سے نمٹنے کے سامان کا ہونا لازمی ہے۔

اگرچہ اتروڑ کے بازار سے بنیادی ضروریات کی اشیاء دستیاب ہیں لیکن سیاحتی حوالے سے سہولیات نا ہونے کے برابر ہیں۔ رہائشی سہولیات کی قلت اور کسی قابل ذکر ہوٹل کا نا ہونا سیاحوں کے لئے مشکلات کا سبب ہیں۔

سلسلۂ ہندوکش کے رنگ

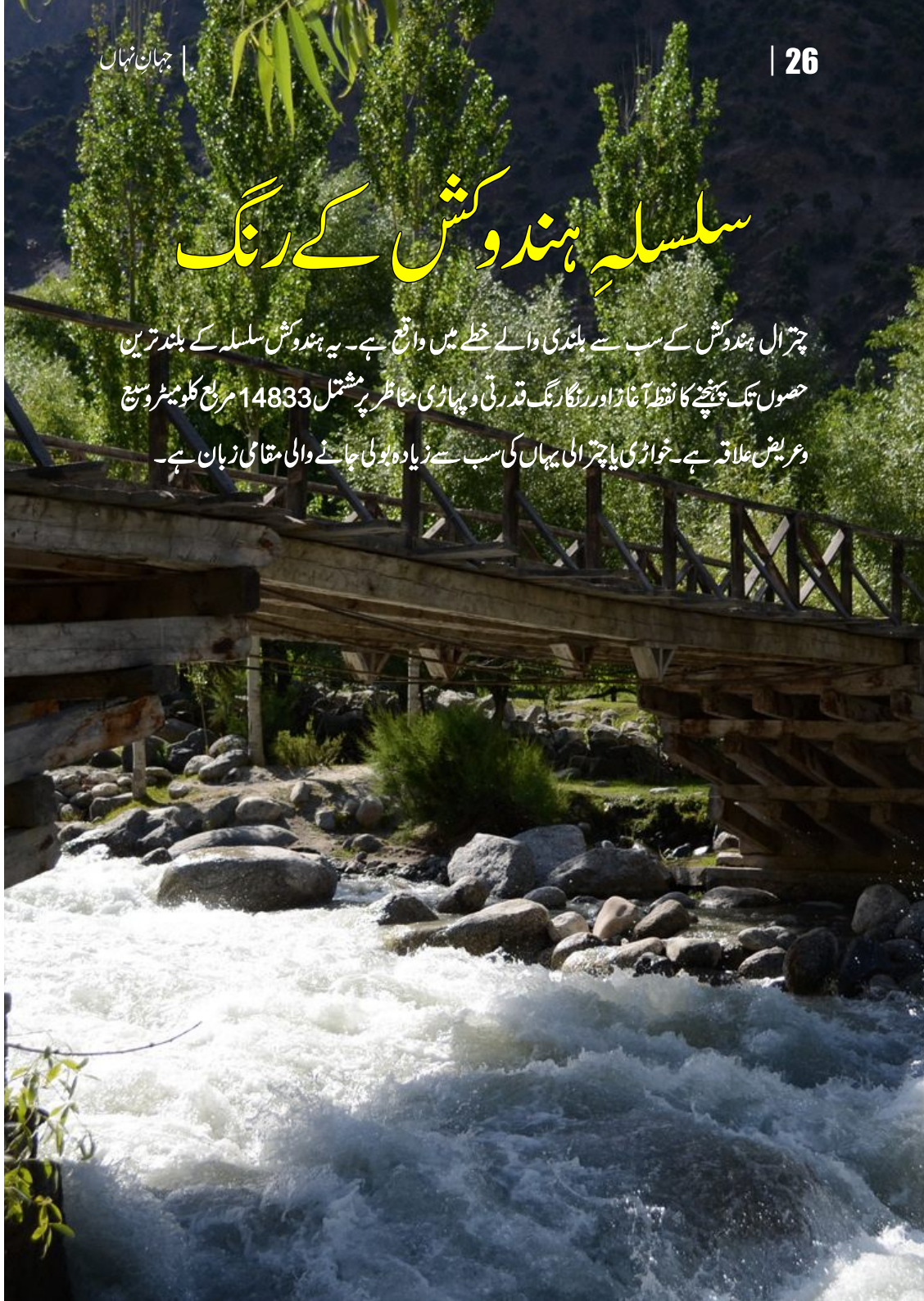

چترال ہندوکش کے سب سے بلندی والے خطے میں واقع ہے۔ یہ ہندوکش سلسلہ کے بلند ترین حصوں تک پہنچنے کا نقطۂ آغاز اور رنگا رنگ قدرتی و پہاڑی مناظر پر مشتمل 14833 مربع کلومیٹر وسیع وعریض علاقہ ہے۔ خواڑی یا چترالی یہاں کی سب سے زیادہ بولی جانے والی مقامی زبان ہے۔

تاریخ میں 'ہندوکش' کا نام مشہور سیاح ابنِ بطوطہ (1334ء) کے حوالے سے ملتا ہے۔ ابن بطوطہ نے اس نام کی وجہ یہ لکھی کہ بہت بڑی تعداد میں قیدی ہندوستانی لڑکے اور لڑکیاں جو افغانستان اور دیگر علاقوں میں لے جائے جاتے تھے اس پہاڑی علاقے میں انتہائی برف اور شدید ترین ٹھنڈ کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے تھے۔

افغانستان کے دارلحکومت کابل کے شمال مغربی پہاڑی علاقے سے شروع ہونے والا یہ پہاڑی سلسلہ بدخشاں، نورستان (افغانستان) اور پاکستان میں چترال اور گلگت میں غذر، اشکومن اور یاسین کے علاقوں پر پھیلا ہوا ہے۔ سلسلہ ہندوکش کی اوسط بلندی 4500 میٹر ہے جبکہ لمبائی میں یہ تقریباً 966 کلومیٹر ہے۔ دریاؤں میں کابل، ہلمند، ہری رود اور کنار کے قابل ذکر ہیں۔ ترچ میر، نوشاق، استرونال اور سرغرار کی چوٹیاں اس سلسلہ میں شامل بلند ترین چوٹیوں میں سے ہیں۔ یہ سب چوٹیاں سلسلہ ہندوکش کے پاکستانی حصہ میں واقع ہیں۔

چترال ہندوکش کے سب سے بلندی والے خطے میں واقع ہے۔ یہ ہندوکش سلسلہ کے بلند ترین حصوں تک پہنچنے کا نقطۂ آغاز اور رنگا رنگ قدرتی و پہاڑی مناظر پر مشتمل 14833 مربع کلومیٹر وسیع وعریض علاقہ ہے۔ خواڑی یا چترالی یہاں کی سب سے زیادہ بولی جانے والی مقامی زبان ہے۔

چترال کا سفر کئی وجوہات کی بنا پر دلچسپ، دلفریب اور مفید مشاہدات اور معلومات کا حامل ہے۔ صوبہ خیبر پختون خواہ کی طرف سے مالاکنڈ اور دیر کے خوبصورت علاقوں سے ہوتے ہوئے آسمان کو چھوتے لواری ٹاپ کے ذریعے چترال میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ لواری ٹاپ پاکستان میں واقع بلند ترین پہاڑی دروں میں سے ہے اور 3200 میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ بہت سے سیاح لواری ٹاپ کی شہرت کی وجہ سے بھی خصوصی طور پر بذریعہ سڑک چترال کے سفر کو ترجیح دیتے ہیں۔ لواری ٹاپ سے دونوں اطراف یعنی دیر اور چترال کے علاقوں کا نظارہ قابل دید ہے۔ اپنی بلندی کی وجہ سے لواری ٹاپ نومبر کے وسط سے لیکر اخیر اپریل تک برف سے ڈھکا رہتا ہے اور زمینی سفر ممکن نہیں رہتا۔ حکومت نے ان سفری مشکلات کے باعث لواری سرنگ تعمیر کی ہے جو ہر طرح کے موسم میں سفر کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ سیاحت کے فروغ کی سمت بھی ایک اچھی پیشرفت ہے۔

گلگت بلتستان سے چترال کا راستہ گلگت، غذار اور شندور سے ہوتا ہوا چترال تک پہنچاتا ہے۔ یہ ایک طویل سفر ہے اور اپنی مخصوص پہاڑی خصوصیات، بلندی اور انواع کے قدرتی مناظر کی وجہ سے سیاحوں میں خاصا پسند کیا جاتا

ہے۔زمینی سفر کے علاوہ چترال کا ہوائی اڈہ بھی باقی ملک سے رابطے اور آمدورفت کا اہم ذریعہ ہے۔

ہندوکش پہاڑی سلسلہ کی سب سے بلند چوٹی ترچ میر (7708 میٹر) کے قدموں میں آباد چترال سیاحوں کے لئے کئی انداز سے تفریح وسیاحت کے مواقع فراہم کرتا ہے۔مہم جوئی کے شائقین یہاں کی بلند وبالا برف پوش چوٹیوں کو سر کرنے، بیس کیمپ تک ٹریکنگ کی خواہش میں یا وسیع وعریض گلیشیئرز کا نظارہ کرنے آتے ہیں۔عام سیاح یہاں کے پرفضا ماحول، قدرتی حسن، بودوباش اور قدیم رسوم رواج کا مشاہدہ کرکے اپنے سفر کو یادگار بناتے ہیں۔دریائے چترال جسے دریائے کنار بھی کہا جاتا ہے ہندوکش کی بلند و بالا چوٹیوں کی برف اور بڑے بڑے گلیشیئرز کا پانی لئے اور اپنے اردگرد سبزے کو سیراب کرتا چترال کی خوبصورتی کا ایک اہم جزو ہے۔دریائے چترال اپنی ڈھلوان کی طرف بہتا بالآخر دریائے کابل میں شامل ہوجاتا ہے اور پاکستان کے پانی کے ذخائر کا اہم سبب ہے۔

وادی کیلاش! چترال کی شہرت کا سب سے بڑا سبب اور سیاحوں کے لئے بے پناہ کشش کا حامل ہے۔وادی کیلاش میں آباد 3000 کے قریب کیلاشی اپنے یگانہ رہن سہن، رسوم ورواج اور طرز زندگی کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔رمبور، بمبوریت اور بریر کی وادیوں پر مشتمل علاقہ کیلاش کے یہ مکین بااختلاف روایت سکندر اعظم کی فوجیوں کی اولاد کہلائے جاتے ہیں اور اپنے مذہب اور روایات کی بدولت تمام دنیا میں منفرد ہیں۔اپنے مخصوص دیوتاؤں پر یقین رکھنے والے یہ کیلاشی اپنی پیدائش، موت، زراعت، موسموں اور غم وخوشی کے موقعوں پر مخصوص دیوتاؤں کی عبادت کرتے ہیں۔اس کے علاوہ موسموں کے آغاز واختتام پر یہ مختلف قسم کے جشن کا انعقاد کرتے اور موسیقی و رقص کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔کیلاش کے یہ میلے یا جشن دنیا بھر میں مشہور ہیں اور ان دنوں میں سیاحوں کے ہجوم کی وجہ سے کیلاش میں رہائش کے لئے جگہ تک ملنی مشکل ہوجایا کرتی ہے۔

کیلاش کی وجہ شہرت صرف یہاں کے مخصوص کیلاشی ہی نہیں بلکہ یہ علاقہ اپنی خوبصورتی اور دلکشی کے باعث بھی سیاحوں کو یہاں ٹھہرنے پر مجبور کرتا ہے۔شفاف پانی کی ندیاں اور چشمے، پھولوں اور ذائقہ دار پھلوں سے بھرے درخت اور پودے، حسین قدرتی نظارے حقیقتاً دلفریب اور یادگار لمحات کو جنم دیتے ہیں۔یہاں کے میوہ جات اور پھل اپنی لذت اور ذائقے میں لاجواب ہیں اور مختلف مقامی مشروبات اور مصنوعات میں عام طور پر استعمال کئے

جاتے ہیں۔

چند سال قبل کیلاش کے حوالے سے ایک خبر کئی دن تک پاکستان کے اخبارات میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔خبر کیلاش کے جنگلات میں ایک انسان نما لمبے بالوں اور اپنی ہیئت اور جثہ کے اعتبار سے منفرد مخلوق کی موجودگی کے انکشاف سے متعلق تھی۔کئی مقامی لوگوں نے اس مخلوق کی موجودگی کی شہادت دی۔ ہمالیائی برفانی انسان جسے عرف عام میں 'یٹی' کا نام دیا جاتا ہے کا ذکر پہاڑی کہانیوں اور داستانوں میں عرصہ دراز سے کیا جاتا رہا ہے۔تبت اور نیپال کے علاقوں کے علاوہ بھی بہت سے بلند علاقوں میں کئی اداروں اور لوگوں نے اس کی تحقیقات کے لئے کوششیں بھی کیں جو کہ اب تک جاری ہیں لیکن قدموں کے نشانات، غیر یقینی علامات اور عینی شہادتوں کے علاوہ مکمل تصدیق نہ کی جاسکی۔اس علاقے میں بھی اس مخلوق کی موجودگی چند دن تک ظاہر ہوتی رہی لیکن بعدازیں یہ دشوار، بلند اور بے آباد پہاڑوں اور جنگلات میں غائب ہوگئی۔

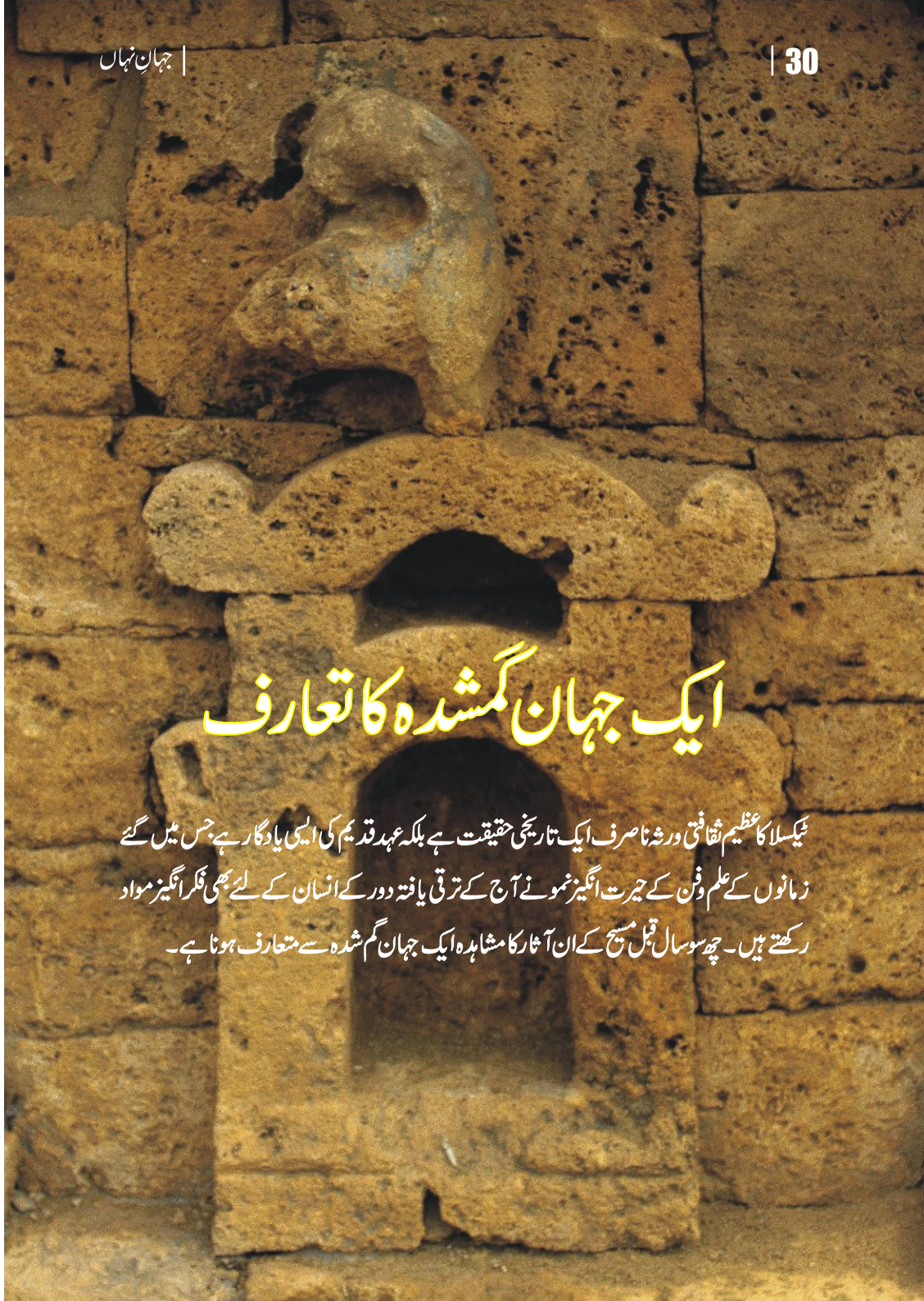

ایک جہان گمشدہ کا تعارف

ٹیکسلا کا عظیم ثقافتی ورثہ نا صرف ایک تاریخی حقیقت ہے بلکہ عہد قدیم کی ایسی یادگار ہے جس میں گئے زمانوں کے علم وفن کے حیرت انگیز نمونے آج کے ترقی یافتہ دور کے انسان کے لئے بھی فکر انگیز مواد رکھتے ہیں۔ چھ سو سال قبل مسیح کے ان آثار کا مشاہدہ ایک جہان گم شدہ سے متعارف ہونا ہے۔

کھنڈرات کا لفظ اکثر لوگوں کے لئے عموماً تفریح کے پہلو سے عاری ہی ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں رنگینیوں کا وہ تصور نہیں پایا جاتا جو بہت سے لوگوں کے مزاج کے موافق ہو۔ ان مقامات کی مسلم تاریخی حیثیت اپنی جگہ صحیح لیکن صرف سنجیدہ مزاج یا مطالعے کے رسیا لوگ ہی کھنڈرات اور تاریخی مقامات کی طرف نکلتے ہیں۔ اس لئے ایسی جگہوں بالخصوص کھنڈرات میں اکثر اوقات سکوت اور ویرانی ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی تبدیلی کے لئے ہی سہی ایسے مقامات کی سیاحت دلچسپی سے خالی ہرگز نہیں ہوتی۔

برصغیر میں تہذیب وثقافت کی تحقیق ہو یا انسانی تمدن کی ترویج وترقی کا مطالعہ، ایک مقام جس پر اکثر نگاہیں آ کر ٹھہرتی ہیں وہ جگہ ٹیکسلا ہے۔

راولپنڈی اسلام آباد سے براستہ جی ٹی روڈ پشاور کی طرف چلیں تو بتیس کلومیٹر کے فاصلے پر ٹیکسلا آ جاتا ہے۔ یہاں سے ایک سڑک ٹیکسلا چھاؤنی سے ہوتی ہوئی خانپور اور ہری پور کی طرف جاتی ہے۔ اسی سڑک کے دونوں طرف ٹیکسلا کے قدیم کھنڈرات واقع ہیں۔

ٹیکسلا کا عظیم ثقافتی ورثہ نا صرف ایک تاریخی حقیقت ہے بلکہ عہد قدیم کی ایسی یادگار ہے جس میں گئے زمانوں کے علم وفن کے حیرت انگیز نمونے آج کے ترقی یافتہ دور کے انسان کے لئے بھی فکر انگیز مواد رکھتے ہیں۔ چھ سو سال قبل مسیح کے ان آثار کا مشاہدہ ایک جہان گم شدہ سے متعارف ہونا ہے۔ انسانی عروج وزوال کی یہ نشانیاں یقیناً اپنے اندر گہرائی اور سوچ کے لئے کئی زاویئے رکھتی ہیں۔

ٹیکسلا کا لفظ 'تکشا شیلا' سے نکلا ہے۔ تکشا شیلا گندھارا دور کا ایک اہم علمی مرکز اور شہر تھا۔ یہ ایک ہندو بادشاہ تکشا سے منسوب ہے جس نے اسے آباد کیا۔ یہ ہندو اور بدھ مت مذاہب کے پیروکاروں کا شہر رہا ہے اور مذہبی اعتبار سے اسے ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ تکشا شیلا شاہراہ ریشم، کشمیر، پشاور اور پٹنہ ہندوستان سے آنے والے قافلوں اور مسافروں کے لئے مرکزی مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس طرح ایک نہایت بڑے علاقے کے درمیان آمد ورفت کا مرکز رہنے کی وجہ سے گندھارا تہذیب اپنے دور میں بھی خاص حیثیت رکھتی تھی۔

گندھارا پانچ سے سات سو سال قبل مسیح کی ایک سلطنت کا نام تھا جو شمالی پاکستان، کشمیر اور افغانستان کے بعض علاقوں پر مشتمل تھی۔ اس ریاست کی زیادہ تر آبادی سطح مرتفع پوٹھوہار، پشاور اور دریائے کابل سے متصل علاقوں

میں تھی۔اس کے اہم شہروں میں پروشاپورہ (موجودہ پشاور) اور تکشا شیلا (موجودہ ٹیکسلا) زیادہ اہم تھے۔

تاریخی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ گندھارا چھ سو سال قبل مسیح سے گیارہویں صدی بعد عیسوی تک قائم رہا۔اپنی تمدنی زندگی کا عروج اس علاقے کو پہلی صدی عیسوی سے پانچویں صدی عیسوی میں ملا جب یہاں 'کشن' بادشاہت کا راج تھا۔کشن بدھ مت سے تعلق رکھتے تھے۔1021ء میں یہ علاقہ سلطان محمود غزنوی نے فتح کر لیا۔سلطان محمود غزنوی کے دور میں گندھارا کا نام رفتہ رفتہ محو ہوتا گیا۔بعد میں مغلیہ دور میں یہ علاقہ کابل کے صوبے میں شامل کر دیا گیا۔کہا جاتا ہے کہ افغان صوبہ کندھار کا نام گندھارا کی ہی بدلی ہوئی شکل ہے۔

انیسویں صدی میں انگریز سپاہیوں اور اہلکاروں نے برصغیر کی قدیم تاریخ میں دلچسپی لینا شروع کی۔1830ء میں یہاں سے اشوکا کے دور کے چند سکے دریافت ہوئے۔بعض چینی تاریخی کتابوں اور ان سکوں کی تحقیقات نے 1860ء میں ٹیکسلا کے نواح میں آثار قدیمہ کا سراغ لگانے میں مدد دی اور 1912ء سے 1934ء تک کی کھدائیوں نے کی زمینوں میں دفن ان رازوں سے پردہ ہٹایا۔کھدائی کے دوران بڑی تعداد میں قدیم شہروں، سٹوپہ اور عبادت گاہوں کا انکشاف ہوا۔ان انکشافات کی روشنی میں گندھارا اور یہاں کے علوم وفنون اور تاریخ کا تعین ممکن ہوا۔آج ٹیکسلا میں گندھارا کی ان تمام آبادیوں، تعمیرات اور مذہبی زیارتوں کے آثار و باقیات ہیں۔

کھدائی کے بعد مختلف جگہوں سے جو آثار قدیمہ برآمد ہوئے ہیں ان میں بعض نہایت بوسیدہ حال دیواروں پر مشتمل ہیں جبکہ کئی مقامات پر قدیم تعمیرات کا اندازہ کر کے اور کھدائی کے دوران حاصل ہونے والی قابل استعمال مواد کے ذریعے ماہرین آثار قدیمہ نے تعمیرات کی ہیں۔

ٹیکسلا کے کھنڈرات یوں تو کئی کلومیٹر کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان میں سے مشہور نام بھڑ ماؤنڈ، سرکپ، جولیاں، موہڑہ مراد اور سرسکھ قابل ذکر ہیں۔

بھڑ ماؤنڈ کے کھنڈرات تقریباً ایک کلومیٹر کے رقبے میں ہیں۔یہاں کی کھدائی سے ظاہر ہوا کہ یہاں چار تہوں میں مختلف ادوار کے آثار موجود ہیں۔یہاں کی گلیاں تنگ ہیں اور مکانات کی ساخت بتاتی ہے کہ یہ کسی خاص ترتیب سے نہیں بنائے جاتے تھے۔ان مکانات میں کھڑکیاں باہر کے رخ کی بجائے ایک اندرونی صحن میں کھلتی تھیں اور تمام کمرے اسی صحن کے گرد بنائے جاتے تھے۔

سرکپ کے کھنڈرات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ شہر ایک مرکزی شاہراہ کے گرد تعمیر کیا گیا تھا جس سے پندرہ ذیلی راستے نکلتے تھے۔ان کھنڈرات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ یونانی طرز تعمیر کے حامل ہیں۔یہاں کی خاص بات بدھا کے سٹوپہ بھی ہیں جو سرکپ میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔ایک ہندو مندر کی یہاں موجودگی ان مذاہب کے مابین روابط کا ثبوت پیش کرتی ہے۔

جولیاں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک مرکزی سٹوپہ اور دوسرا مذہبی عبادت گاہ اور درسگاہ۔یہ کھنڈرات ایک بلند ٹیلے پر واقع ہیں۔مرکزی سٹوپہ بری طرح تباہی کا شکار ہے البتہ اس کے کچھ حصوں کو اس کی اصلی حالت میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔اس بڑے سٹوپہ کے اردگرد 21 چھوٹے سٹوپہ ہیں۔ماہرین کا خیال ہے کہ اصل میں یہ چھوٹے سٹوپہ بھکشوؤں کے مقبرے ہیں۔ عبادت گاہ ایک مرکزی تالاب کے گرد قائم کی گئی تھی۔اس تالاب کو نہانے دھونے اور دیگر ضروریات کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔تالاب کے گرد 28 کمرے ہیں جن میں یہاں درس وتدریس کے لئے آنے والے طلبا قیام کیا کرتے تھے۔

موہڑہ مراد و کے کھنڈرات بھی جولیاں کے کھنڈرات سے مشابہہ ہیں اور یہاں بھی ایک سٹوپہ اور عبادت گاہ کے آثار پائے جاتے ہیں۔یہ جولیاں سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں۔یہ ایک وادی میں واقع ہیں جہاں سے اردگرد کی پہاڑیوں کا منظر خاصا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔

سرسکھ کے کھنڈرات میں اہم چیز یہاں موجود ایک طویل دیوار ہے جو پانچ کلومیٹر لمبی ہے۔اس دیوار کی موٹائی ساڑے پانچ میٹر ہے۔یہ دیوار شہر کی حفاظت کے لئے تعمیر کی گئی تھی۔اس کی تعمیر میں چھوٹے اور بڑے پتھروں کی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔

گندھارا میں انسانی دلچسپی کا اہم سبب یہاں کا مخصوص آرٹ بھی ہے۔بدھ مت کے ان فنون کی رنگینی مختلف قومیتوں کے باہم ملاپ کے مرہون منت ہے۔اس آرٹ کو یونانی، شامی، فارسی اور ہندوستانی علوم وفنون نے بام عروج تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ٹیکسلا کے نواح سے حاصل ہونے والے ان نوادرات میں بدھ مت مذہب کے بانی بدھا کے مجسمے، اہم شخصیات کے مجسمے، پتھر پر کھدائی کے ذریعے بنائی گئی اشکال، تصاویر اور مجسمے، دھاتی برتن، سکے اور زیورات وغیرہ شامل ہیں۔یہ تمام نوادرات آج بھی پاکستان سمیت دنیا بھر کے عجائب خانوں

کی زینت ہیں۔ٹیکسلا میں واقع مشہور میوزیم میں ان یگانہ روزگار تاریخی اور دلچسپی کی حامل اشیاء کا تفصیلی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

ٹیکسلا کے نواح میں واقع یہ آثار قدیمہ جنہیں ہم عموماً کھنڈرات کے نام نے پہچانتے اور اس وجہ سے کم اہمیت کی جگہ سمجھتے ہیں، ثقافت کے عالمی ورثے کا اہم حصہ ہیں۔1980ء میں یونیسکو نے ٹیکسلا کے ان آثار قدیمہ کو عالمی ثقافتی ورثہ قرار دیا۔اس عالمی ورثے کی زیارت کے لئے اندرون و بیرون ملک کے سیاح ٹیکسلا کا سفر کرتے ہیں اور اپنی اپنی دلچسپی کے مطابق معلومات اور مشاہدات سے مستفید ہوتے ہیں۔

تہذیبوں کے اتار چڑھاؤ کے اس مطالعے اور قدیم آثار کے اس مشاہدے میں دو قسم کے سوال ذہن میں ضرور ابھرتے ہیں۔

ایک یہ کہ دنیا نے ترقی کی منازل کیسے طے کیں؟ اور دوسرا یہ کے ایک رواں دواں سلطنت کھنڈرات میں کیوں بدل گئی؟

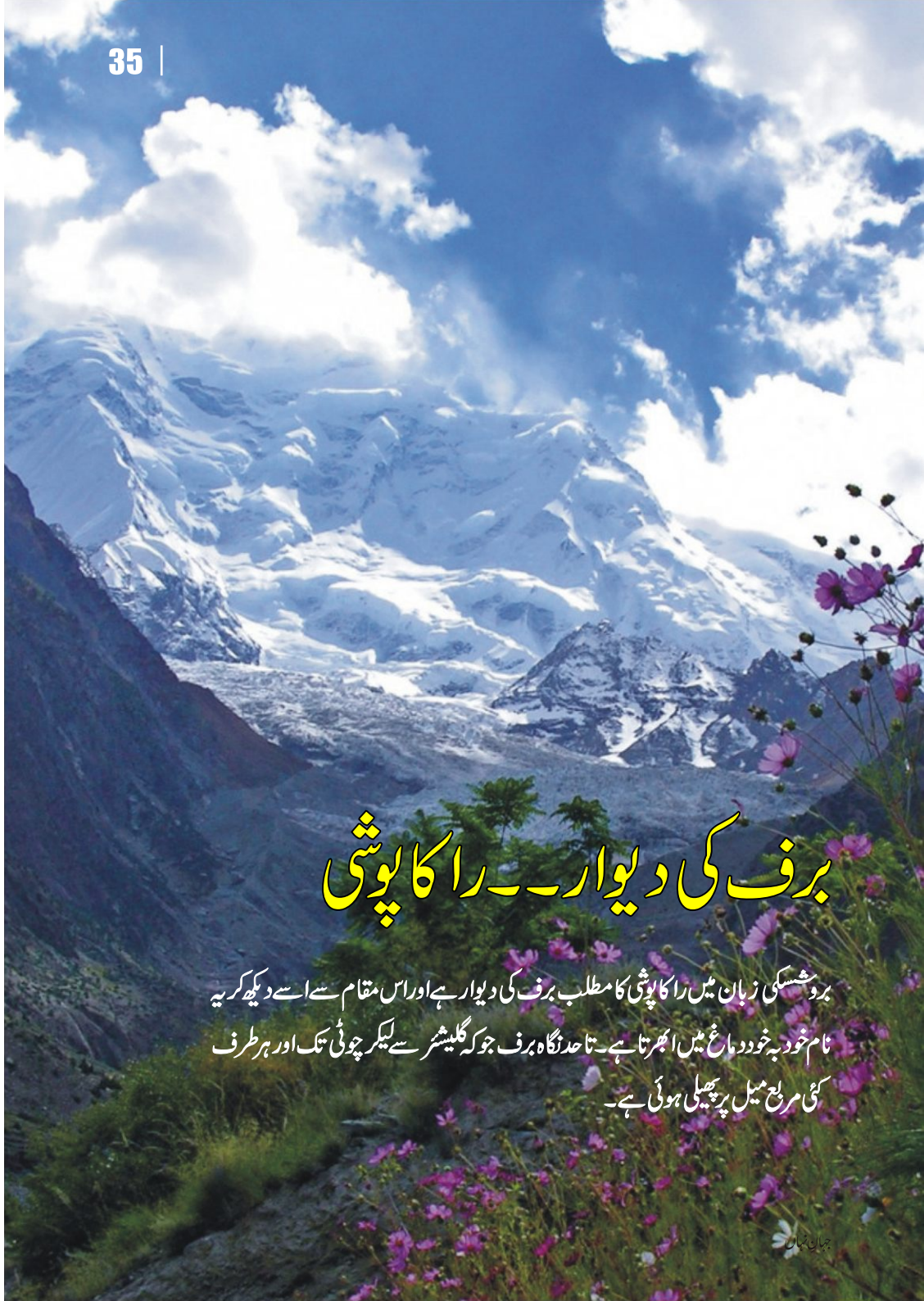

برف کی دیوار۔۔راکاپوشی

بروشسکی زبان میں راکاپوشی کا مطلب برف کی دیوار ہے اور اس مقام سے اسے دیکھ کر یہ نام خود بہ خود دماغ میں ابھرتا ہے۔تاحدنگاہ برف جو کہ گلیشئر سے لیکر چوٹی تک اور ہر طرف کئی مربع میل پر پھیلی ہوئی ہے۔

نگر،قراقرم کے سینے میں آباد پاکستان کا وہ علاقہ جسے قدرت نے عجائبات ومناظر کا ایک اچھوتا امتزاج عطا کیا ہے۔ بلند وبالا برف پوش چوٹیاں، شفاف پانی کی ندیاں، اپنی نوعیت کے منفرد ترین گلیشیئر، گھنے جنگلات، سبزہ زاراور آبشاریں: یہ تمام اجزا جو کسی بھی خوابناک خوبصورتی کی عکاسی کر سکتے ہیں نگر کو عطا ہوئے ہیں۔انہی علامات حسن میں اپنی خوبصورتی میں بے مثال پہاڑی چوٹی جسے دنیا کی خوبصورت ترین چوٹیوں میں شمار کیا جاتا ہے راکاپوشی ہے۔راکاپوشی کی بلندی سات ہزار سات سو اٹھاسی میٹر(25550فٹ) ہے اور یہ پاکستان میں واقع بلند ترین چوٹیوں میں گیارہویں نمبر پر ہے۔گودنیا میں اس سے بلند چوٹیوں کی تعداد چھبیس ہے لیکن اسے یہ انفرادیت حاصل ہے کہ گُلمَت (شاہراہ قراقرم،نگر) کے مقام سے اسے دیکھا جائے تو یہ دنیا کی سب سے بلند مسلسل ڈھلوان ہے۔اس مقام پر آپ کی سطح سے لیکر راکاپوشی کی چوٹی تک ایک متواتر چڑھائی ہے جسکی اونچائی پانچ ہزار آٹھ سو اڑتیس میٹر ہے! جبکہ گُلمَت ہی سے اسکی چوٹی تک کا فاصلہ گیارہ کلومیٹر ہے یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا کے کسی اور مقام کو حاصل نہیں۔راکاپوشی پہاڑ کی چوڑائی بھی غیر معمولی ہے اور مشرقی سمت سے لیکر مغربی سمت تک اس کا عرض 20 کلومیٹر تک ہے۔

راکاپوشی تک جانے کے لئے گلگت پہلی منزل ہے۔گلگت کا رقبہ 38021 مربع کلومیٹر ہے اور دنیا کے مشہور مقامات مثلاً شندور، یاسین، غذر، اشکومن، نلتر، استور، ہنزہ اور نگر وغیرہ کے مشہور علاقے گلگت میں ہی واقع ہیں۔گلگت کے شمال مغرب میں واخان ہے جو کہ افغانستان کی ایک باریک پٹی ہے۔واخان کی دوسری طرف تاجکستان واقع ہے شمال اور شمال مشرقی اطراف میں چین کا صوبہ سنکیانگ، شمال مشرق میں مقبوضہ کشمیر اور شمال میں آزاد کشمیر واقع ہیں۔گلگت میں زیادہ بولی جانے والی زبان شنیا ہے جبکہ بروشسکی زبان ہنزہ اور نگر اور واخی اور خواڑی زبانیں بھی گلگت کے اکثر علاقوں میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔

گلگت سے مختلف گاڑیاں نگر اور ہنزہ کے لئے ہر وقت دستیاب ہیں اور علی آباد تک پہنچاتی ہیں۔علی آباد ہنزہ اور نگر دونوں علاقوں کے لئے آسان اور عین شاہراہ قراقرم پر واقع مقام ہے۔راکاپوشی تک پہنچنے کا راستہ علی آباد سے پہلے ہی ایک گاؤں پسن سے ہے۔اگرچہ راکاپوشی جو کہ پہاڑی چوٹیوں کا ایک سلسلہ بھی ہے، کئی راستوں سے سیاحوں کی پہنچ میں ہے لیکن سب سے مشہور اور خوبصورت راستہ پسن اور مناپن گاؤں سے ہی گزرتا ہے۔سیاحت

کا موسم دیگر شمالی علاقہ جات کی طرح یہاں بھی مئی سے شروع ہوکر ستمبر کے آخر میں ختم ہوتا ہے۔ جون سے پہلے زیادہ بلند راستوں سے برف مکمل طور پر نہیں پگھلی ہوتی اور بعض جگہوں پر سفر میں مشکلات پیدا کرسکتی ہے۔ مناپن گاؤں سے لیکر راکاپوشی بیس کیمپ اور واپسی تک پیدل سفر ہے اور تین یا چار دن میں بآسانی طے کیا جاسکتا ہے۔ مناپن گاؤں سے آگے مناسب خوراک اور ہوا بند سفری خیمہ کا بندوبست ضروری ہے۔ خوراک اور دیگر ضروری سامان گلگت، ہنزہ اور نگر کے بازاروں میں عام طور پر دستیاب ہے جبکہ پسن اور مناپن وغیرہ سے آٹا دال چاول اور بنیادی خوارک کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ مناسب ترین طریقہ مکمل تیاری اور منصوبہ بندی کے ساتھ تمام ضروری سامان اپنے ساتھ لانا ہی ہے جو دوران سفر آپ کو غیر ضروری وزن، وقت اور اخراجات میں معاون ہوگا۔

اس سفر میں تیز رفتار و پرشور دریائے مناپن آپکے ساتھ ساتھ اپنے ماخذ مناپن گلیشیر تک چلتا ہے۔ دریائے مناپن میں برف کے چھوٹے بڑے ٹکڑے بھی گلیشئر سے پانی کے ساتھ بہہ آتے ہیں اور گاؤں کے بچے تواضع کے طور پر سیاحوں کو پیش کرتے ہیں۔ دو سے تین گھنٹے کی مسافت کے بعد راستے میں پتھروں سے بنے چند چھوٹے چھوٹے مکانات نظر آتے ہیں جہاں مناپن گاؤں سے گرمیوں کا موسم گزارنے والے چند خاندان آباد ہیں۔ یہ لوگ گاؤں کے پالتو جانوروں کی افزائش، خوراک اور ان سے حاصل کردہ دودھ سے مکھن، پنیر، گھی اور لسی وغیرہ تیار کرتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں ٹھنڈی ندیوں کے ساتھ زمین میں گڑھے بنا کر محفوظ کی جاتی ہیں۔

اسی راستے پر دو مقامات پر بڑی بڑی اور نہایت دلفریب آبشاریں آپ کو اپنے پاس بہت دیر تک رکنے پر مجبور کرتی ہیں اور طبیعت میں آسودگی و لطافت کا باعث بنتی ہیں۔

چند منٹ بعد ایک تنگ اور مشکل راستے سے گزرتے ہوئے آپ اچانک ایک تاحدنگاہ وسیع و عریض جنت نظیر سبزہ زار میں داخل ہو جاتے ہیں اور سکون کا احساس ماحول کی پرکیف فضا میں ڈھل کر آپ کے تمام وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ وسیع و عریض ڈھلوانی سبزہ زار جو کہ اپنی اونچائی کی سمت ایک گھنے جنگل سے شروع ہوکر گھاس اور پھولوں سے مزین، شفاف پانی کے ٹھنڈے چشموں سے آراستہ ایک بڑے رقبے کا احاطہ کرتے ہوئے گہرائی میں مناپن گلیشیر کی سلیٹی مائل سطح پر ختم ہوتا ہے۔ سیاح عموماً اس مقام پر جو کہ ہپاکن کہلاتا ہے کم از کم ایک دن ضرور قیام کرتے ہیں۔ یہاں سے لیکر راکاپوشی بیس کیمپ تک کا سفر اسی گھنے جنگل میں اونچی نیچی پگڈنڈی پر مشتمل

ہے۔ بائیں ہاتھ پر مناپن گلیشیر اور دیران پیک، پیچھے کی سمت مناپن گاؤں، شاہراہ قراقرم، ہنزہ اور نگر کے وسیع علاقے کا نظارہ تمام راستے آپ کا ساتھ دیتا ہے۔

آپ کی اگلی منزل تغافری ہے جہاں پر راکاپوشی اپنے تمام تر ناقابل بیان حسین مناظر کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ تغافری کی وادی میں اترنے سے پہلے مناپن گلیشئر اپنی وسعت کے ساتھ پہلی دفعہ آپ کا استقبال کرتا ہے۔ ایک اونچے ٹیلہ نما مقام سے کھڑے ہوکر نیچے کی طرف دیکھیں تو گلیشیر مختلف اشکال اور جسامت کے خوبصورتی کے ساتھ تراشے گئے مجسموں کا ایک ہجوم نظر آتا ہے! یہ موسمی اثرات اور تیز ہواؤں کا کرشمہ ہے اور برف کو ان اشکال میں ڈھال کر قدرت نے انسان کے لئے ایک عجوبہ تشکیل دیا ہے۔

تغافری، ہپاکن اور دیگر کیمپ سائٹس پر مختلف اداروں نے سیاحوں کی سہولت اور قدرتی حسن کی حفاظت کے لئے پتھروں سے احاطہ شدہ کیمپنگ ایریا بنائے ہوئے ہیں جبکہ پختہ یا لکڑی سے بنے بیت الخلا بھی موجود ہیں۔

راکاپوشی کی ایک اور خاصیت یہ ہے کے اکثر اوقات شدید دھند میں لپٹی رہتی ہے اور اپنے ساتھ بہت بڑے علاقے کو بھی دھند کے غلاف میں لپیٹ دیتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے "مدر آف مِسٹ" یعنی دھند کی ماں بھی کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس دھند کی وجہ سے سیاح راکاپوشی کی ایک مکمل جھلک دیکھنے کے لئے کئی کئی روز انتظار بھی کرتے ہیں۔

بروشسکی زبان میں راکاپوشی کا مطلب برف کی دیوار ہے اور اس مقام سے اسے دیکھ کر یہ نام خود بہ خود دماغ میں ابھرتا ہے۔ تاحدنگاہ برف جو کہ گلیشئر سے لیکر چوٹی تک اور ہر طرف کئی مربع میل پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں سے راکاپوشی کی تمام چوٹیاں اور گھاٹیاں ایک وسیع رقبہ پر محیط اور بلندی میں آسمان کو چھوتی آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔

عام سیاحوں سے لیکر مہم جوئی کے شوقین کوہ نوردوں کی بڑی بڑی ٹیموں تک بہت سے لوگ ملک و بیرون ملک سے پورا سیزن یہاں موجود رہتے ہیں اور کئی کئی ماہ تک یہاں کے نشیب و فراز کی تحقیقات اور تفریح میں مگن رہتے ہیں۔ اکثر سیاح اور کوہ نورد یہاں سے گلیشیر پار کر کے دوسری طرف واقع ایک اور خوبصورت وادی کچیلی تک جاتے ہیں اور وہاں قیام کرتے ہیں۔

راکاپوشی کوسر کرنے کی بہت سی کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور ایک طویل عرصے سے جاری ہیں لیکن معدود چند خوش نصیبوں کے سوا یہ اعزاز کسی کو حاصل نہیں۔گلگت سے لیکر نگر اور ہنزہ کے تقریباً تمام علاقوں سے راکاپوشی کے نظارے قابل دید ہیں۔سیاحت کے ان حسین مشہور ومعروف علاقوں جہاں فطرت نے اپنے رنگوں کو ان گنت زاویوں میں بکھیر رکھا ہے اور بیشمار بلند و برف پوش چوٹیوں میں بھی راکاپوشی اپنی انفرادیت کی وجہ سے نمایاں نظر آتی ہے اور سیاحوں کی نگاہیں ہر مقام سے اسی پر جمی رہتی ہیں۔

چٹا کٹھہ

برفیلے پہاڑوں کے قدموں میں واقع ہونے کی وجہ سے سال کے چند ہی دن اس جھیل میں پانی نظر آتا ہے۔ باقی تمام سال یہ ٹھوس برف کی شکل اختیار کئے رہتی ہیں۔ گرمیوں کے آخری دنوں میں انتہائی ذوق کے حامل چند خوش قسمت ہی ان جھیلوں کو دیکھ پاتے ہیں۔

پاکستان کی بعض جھیلیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی مختلف اور منفرد ہیں۔ نہایت بلندی پر برفیلے پہاڑوں کے قدموں میں واقع ہونے کی وجہ سے سال کے چند ہی دن ان جھیلوں میں پانی نظر آتا ہے۔ باقی تمام سال یہ ایک ٹھوس برف کی شکل اختیار کئے رہتی ہیں۔ گرمیوں کے آخری دنوں میں انتہائی ذوق کے حامل چند خوش قسمت ہی ان جھیلوں کو دیکھ پاتے ہیں۔ سال کے بیشتر مہینوں میں منجمد شکل کی ان جھیلوں میں سے ایک کا نام چٹہ کٹھہ بھی ہے۔

چٹہ کٹھہ کا مطلب سفید ندی ہے۔ یہ جھیل وادی شونٹر کی چند حیرتوں میں سے ایک اور کئی طلسماتی کہانیوں کی بنیاد ہے۔ وادی شونٹر وادی نیلم سے ملحقہ وادی ہے جو کیل سے شروع ہو کر درہ شونٹر کے ذریعے گلگت بلتستان کے ضلع استور تک جاتی ہے۔ وادی نیلم دریائے نیلم کے دونوں طرف واقع ہے اور مظفر آباد سے اس کا آغاز ہو جاتا ہے۔ کیل تک پہنچنے کے لئے مظفر آباد سے گاڑیاں مل سکتی ہیں۔ چٹہ کٹھہ جھیل کے لئے آخری مقام جہاں تک صرف جیپ جا سکتی ہے وہ دومیل بالا ہے۔ کیل سے دومیل بالا کا فاصلہ بیس کلومیٹر کا ہے۔ ایک دشوار گزار سفر کے بعد دومیل گاؤں چٹہ کٹھہ جھیل کے بیس کیمپ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دومیل بالا دور دراز کے بیشتر پہاڑی علاقوں کی طرح پسماندگی کا شکار ہے۔ یہاں بھی کسی قسم کی سیاحتی سہولیات کا فقدان ہے اور بمشکل ایک چائے خانہ اور اکا دکا دکانوں کے سوا یہاں کسی بھی چیز کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہاں تک کہ کیمپنگ کے لئے ہموار جگہ ڈھونڈنا تک آسان نہیں۔ مجبوری یہ ہے کہ کم از کم ایک رات دومیل میں رہنا ضروری بھی ہے۔ اس کی وجہ وہ آٹھ سے بارہ گھنٹے ہیں جو دومیل سے چٹہ کھٹہ جھیل اور واپسی کے دوران لگ سکتے ہیں۔ اس مکمل دن کی ٹریکنگ کے لئے ضروری ہے کہ کم از کم ایک رات دومیل میں قیام کیا جائے اور صبح جتنی جلد ممکن ہو ٹریکنگ کا آغاز کیا جائے۔ جلد واپسی پر یہ ممکن ہے کہ کیل یا شونٹر پاس سے ہوتے ہوئے استور تک پہنچا جا سکے۔

چٹہ کٹھہ کے لئے ٹریک دریا کے ساتھ ابتدا میں گہرائی کی طرف اور بعد میں مسلسل بلندی کی طرف ہے۔ کسی مقامی گائیڈ کا ساتھ ہونا اس ٹریک کے لئے مناسب ہے۔ بعض مقامات پر راستہ ناقابل شناخت ہے اور کسی بھی انسان کی موجودگی اور رہنمائی اس علاقے میں نا ہونے کے برابر ہے۔ ایسی صورتحال میں بہت سے وقت اور توانائی ضائع ہو جاتی ہے۔

دریا کو انتہائی مخدوش اور عارضی لکڑیوں کے ایک پل پر سے پار کرنے کے بعد ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جہاں آلوؤں کے کھیت اور چند مکانات ہیں۔ کھیتوں سے آگے نکل کر ایک تنگ پگڈنڈی ہے جو متواتر بلندی اور پے در پے موڑوں پر مشتمل ہے۔ اس پگڈنڈی کا اختتام خاصی بلندی پر جا کر ہوتا ہے جہاں درختوں کا سایہ، ٹھنڈی ہوا اور دور دور تک کے حسین نظارے اب تک کی تھکاوٹ کو کافی حد تک کم کر دیتے ہیں۔

یہاں سے آگے ایک آسان اترائی ہے جو چند منٹ میں ایک تنگ وادی میں پہنچا دیتی ہے۔ گرمیوں کے وسط تک یہاں اچھی خاصی برف بھی موجود ہوتی ہے جس پر احتیاط سے چلنا لازم ہے۔ اس وادی کے انتہائی دائیں جانب ایک تنگ موڑ سے ایک مرتبہ پھر بلندی کا آغاز ہوتا ہے جو مسلسل ہے اور جھیل تک چلتا ہے۔ یہاں سے آگے سرسبز ڈھلوانیں، ان ڈھلوانوں پر کھلتے رنگ برنگے پھول اور تین اطراف میں بلندیوں سے گرتی آبشاریں ماحول کو مسحور کن بناتی ہیں۔ یہ ایسی جگہ ہے جہاں ایک نصف دائرے کی وادی میں کئی چھوٹی بڑی آبشاریں اوپر سے پگھلتی برف کے سبب سبز ڈھلوانوں پر گرتی ہیں۔ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا لیکن کسی بھی مختصر جگہ پر شاید اس سے زیادہ آبشاریں کسی اور جگہ نا پائی جاتی ہوں۔ اس حوالے سے یہ علاقہ ان خوبصورت ترین مقامات میں سے ہے جس کا متبادل کوئی نہیں ہے۔

یہاں سے جھیل تک کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں۔ لیکن بلندی اور چڑھائی کی وجہ سے مسلسل چلنا آسان نہیں۔ اس آخری چڑھائی کے بعد ایک ہموار اور قدرے آسان میدان ہے جہاں بڑے بڑے چٹان نما ہموار پتھر ہیں۔ ان پتھروں پر چل کر چند ہی لمحوں میں جھیل آ جاتی ہے۔

یہ جھیل گہرائی میں ہے اور اس کے کناروں تک پہنچنا خطرناک اور مشکل ہے۔ جھیل کی دوسری طرف ہری پربت نامی برف پوش پہاڑ اور اطراف کی دیگر برفیلی چوٹیاں ایک دلفریب نظارہ پیش کرتی ہیں۔ ہری پربت کے بارے میں بھی کئی کہانیاں مشہور ہیں اور ہندومت میں اس پہاڑ کی خاصی اہمیت بتائی جاتی ہے۔

چٹہ کٹھہ جھیل اکتالیس سو میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ اس لحاظ سے یہ پاکستان کی بلند ترین جھیلوں میں سے ایک ہے۔ اس بلندی پر یخ بستہ تیز ہوائیں اور موسمی شدت کیمپنگ اور شب بسری کے لئے مناسب نہیں۔ اچانک آنے والے طوفان اور بارشیں ایک الگ مسئلہ ہیں جو کسی بھی وقت دیکھتے ہی دیکھتے امڈ آتے ہیں۔ ایڈونچر کے شائقین

نسبتاً کم بلند اور محفوظ مقام پر کیمپنگ کر سکتے ہیں جس کے لئے ہر طرح کے ضروری سامان کا ہونا بہت ضروری ہے۔

اپنی نادر خصوصیات کی وجہ سے چٹہ کٹھہ جھیل ایک انتہائی منفرد تجربہ ہے۔ وہ لوگ جو ٹریکنگ کا شوق رکھتے ہیں اور کیمپنگ کے سامان اور تجربے کے حامل ہیں، ان کے لئے یہ جھیل ایک بہترین انتخاب ہے۔ لیکن بغیر ضروری لوازمات اور تجربے کے اس سفر پر نکلنا سفر کی طوالت، دشواری، بلندی اور موسمی شدت کی وجہ سے مناسب نہیں۔

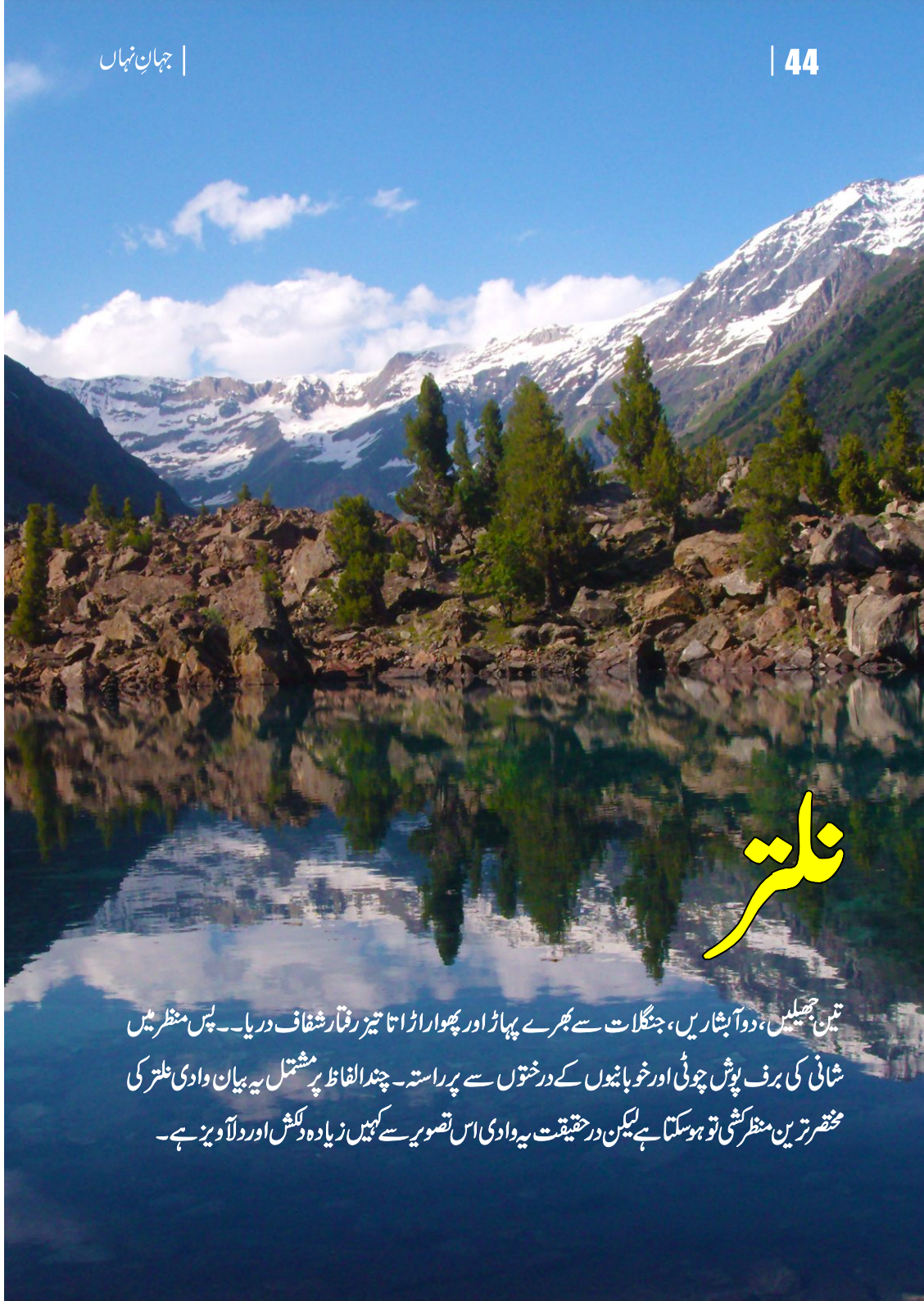

نلتر

تین جھیلیں، دو آبشاریں، جنگلات سے بھرے پہاڑ اور پھوار اڑاتا تیز رفتار شفاف دریا۔۔پس منظر میں شانی کی برف پوش چوٹی اور خوبانیوں کے درختوں سے پر راستہ۔ چند الفاظ پر مشتمل یہ بیان وادی نلتر کی مختصر ترین منظر کشی تو ہوسکتا ہے لیکن درحقیقت یہ وادی اس تصویر سے کہیں زیادہ دلکش اور دلآویز ہے۔

تین جھیلیں، دو آبشاریں، جنگلات سے بھرے پہاڑ اور پھوار اڑاتا تیز رفتار شفاف دریا۔۔پس منظر میں شانی کی برف پوش چوٹی اور خوبانیوں کے درختوں سے پر راستہ۔ چند الفاظ پر مشتمل یہ بیان وادی نلتر کی مختصر ترین منظر کشی تو ہوسکتا ہے لیکن درحقیقت یہ وادی اس تصویر سے کہیں زیادہ دلکش اور دلآویز ہے۔

گلگت شہر کے خشک اور بھورے پہاڑوں کو دیکھ کر یہ گمان کرنا بھی مشکل ہوا کرتا ہے کہ کہیں آس پاس کوئی سرسبز، پرفضا اور قدرتی مناظر سے لبریز خطہ بھی ہوگا!

اس بے یقینی کو دور کرنے کے لئے صرف ایک گھنٹے کا پختہ سڑک کے ذریعے جیپ کا سفر کرنا پڑتا ہے۔گلگت بلتستان کا بیشتر علاقہ مون سون کی پٹی سے علیحدہ ہونے کی وجہ سے اپنا ایک الگ مخصوص موسمی مزاج رکھتا ہے۔لیکن گلگت سے صرف چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع وادی نلتر قدرتی طور پر ایسا موسمیاتی خطہ ہے جہاں بارشوں کی کثرت ہے۔سطح سمندر سے بلندی اور موسم کی اس تبدیلی کی وجہ سے یہاں دیار کے گھنے جنگلات اور سبزے کی بہتات ہے۔

نلتر کی وادی کے دو حصے ہیں۔ایک نلتر پائین جسے زیریں نلتر کہا جاسکتا ہے اور دوسرا نلتر بالا۔نلتر پائین میں مقامی آبادی کے علاوہ پاکستان ائیر فورس کا ایک بیس کیمپ بھی موجود ہے۔مختصر سے بازار کے علاوہ یہاں رہائش اور خوراک کے لئے بنیادی سہولیات بھی میسر ہیں۔نلتر پائین پہنچ کر دائیں طرف کے پہاڑی سلسلے پر دیار کے گھنے جنگلات نگاہوں کو بھانے والا دلفریب منظر ہیں۔گلگت کی خشک گرمی کے بعد یہاں کی راحت افزا ہوا اور سکوت بھی اس سرسبز ماحول کو مزید پرسکون بناتے ہیں۔

نلتر پائین سے آگے پختہ سڑک کا اختتام ہو جاتا ہے اور نلتر بالا تک کچا راستہ ہے۔بعض مقامات پر معمولی لینڈ سلائیڈنگ کے علاوہ عمومی طور پر یہ ایک محفوظ اور خوبصورت راستہ ہے۔دریائے نلتر کے کنارے اور درختوں کے جھنڈ میں چھ کلومیٹر کا یہ فاصلہ پیدل یا جیپ دونوں طرح سے طے کیا جاسکتا ہے۔نلتر بالا تین ہزار میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔گھنے جنگل، جھیلوں اور آبشاروں کی موجودگی کے باعث یہاں سیاحوں کی دلچسپی کے لئے بہت کچھ ہے۔

نلتر کی تینوں جھیلوں کی انفرادیت ان کے مختلف رنگ ہیں۔پہلی جھیل کا مجموعی تاثر سبز رنگ کا ہے۔یہ سبز رنگ اس جھیل کی تہہ میں موجود ایک منفرد اور کائی نما پودوں کے باعث ہے۔اس کے شفاف پانی کی تہہ میں دبیز سبز رنگ کی

یہ تہہ دیکھنے میں انتہائی بھلی لگتی ہے۔اسی جھیل کے سامنے بلند پتھریلی چٹانوں سے گرتی دو آبشاریں منظر کو اور بھی دلفریب بناتی ہیں۔ یہ آبشاریں ان چٹانی بلندیوں پر موجود پگھلتی برف کی وجہ سے ہیں اور قریب جانے پر ان کی ٹھنڈی پھوار اپنا اثر ضرور چھوڑتی ہیں۔جھیل کے کنارے کیمپنگ کے لئے ہموار جگہ اور کھانے کے لئے ایک عارضی ہوٹل بھی موجود ہے۔

دوسری جھیل یہاں سے کوئی پندرہ منٹ کے فاصلے پر کچھ بلندی پر واقع ہے۔مختصر سی یہ خوبصورت جھیل جو پتھروں کے ایک انبار اور درختوں کے درمیان واقع ہے نیلے رنگ میں ڈھلی ہوئی ہے۔جھیل کی دوسری طرف واقع درختوں کا ایک جھنڈ اور اس کے اوپر پانچ ہزار نو سو میٹر بلند شانی کی برف پوش چوٹی کا عکس اس نیلے رنگ میں شامل ہو کر نہایت پر اثر منظر پیش کرتا ہے۔ بائیں جانب قریب کی بلندی سے جا کر درختوں میں گھری اس جھیل کا نظارہ اور بھی زیادہ متاثر کن ہے۔

اس نیلی جھیل کے دائیں جانب، پتھروں اور چٹانوں کے ایک انبار کی دوسری جانب نلتر کی تیسری جھیل چھپی ہوئی ہے۔اس جھیل تک پہنچنے کے لئے پتھروں اور چٹانوں پر کسی قدر اچھل کود کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ جھیل پہلے والی دونوں جھیلوں سے بڑی اور ٹیلوں نما اس چٹانی سلسلے کے اندر تک پھیلی ہوئی ہے۔اس کا پانی قدرے گدلا اور سفیدی مائل ہے۔

وادی نلتر میں ان جھیلوں کے علاوہ شانی گلیشیئر اور شانی بیس کیمپ بھی ایڈونچر کے شائقین کے لئے ایک دلچسپ سفر ثابت ہوسکتا ہے۔اس سفر میں برفانی چوٹیوں کا نظارہ، گلیشیئر کی ٹھنڈک اور ڈھلوانی سبزہ زاروں کے مناظر یقیناً ناقابل فراموش لمحات ہیں۔ یہاں سے ایک راستہ چار ہزار چھ سو میٹر بلند درہ نلتر کے ذریعے گلگت کی ایک اور مشہور وادی اشکومن کے لئے بھی ممکن ہے۔درہ نلتر کی بلندی اور دشوار گزار راستے کی ضروریات کے مطابق تیاری کے بغیر یہ ٹریک بہت مشکل ثابت ہوسکتا ہے۔اپنی دشواریوں کے باوجود دو سے تین دن کا یہ ٹریک برفانی بلندیوں کے سنسنی خیز مناظر سے بھرپور ہے۔

دودھی پت سر

دودھی پت کا مطلب ہی سفید دودھیا پانی ہے ۔اور انتہائی سبز ڈھلوانوں اور ان ڈھلوانوں کی چوٹیوں پر جمی سفید برفوں کے درمیان اس دودھی پت کی جگمگاہٹ کسی بھی تصوراتی تصویر کے حسن سے کہیں بڑھ کر ہے۔

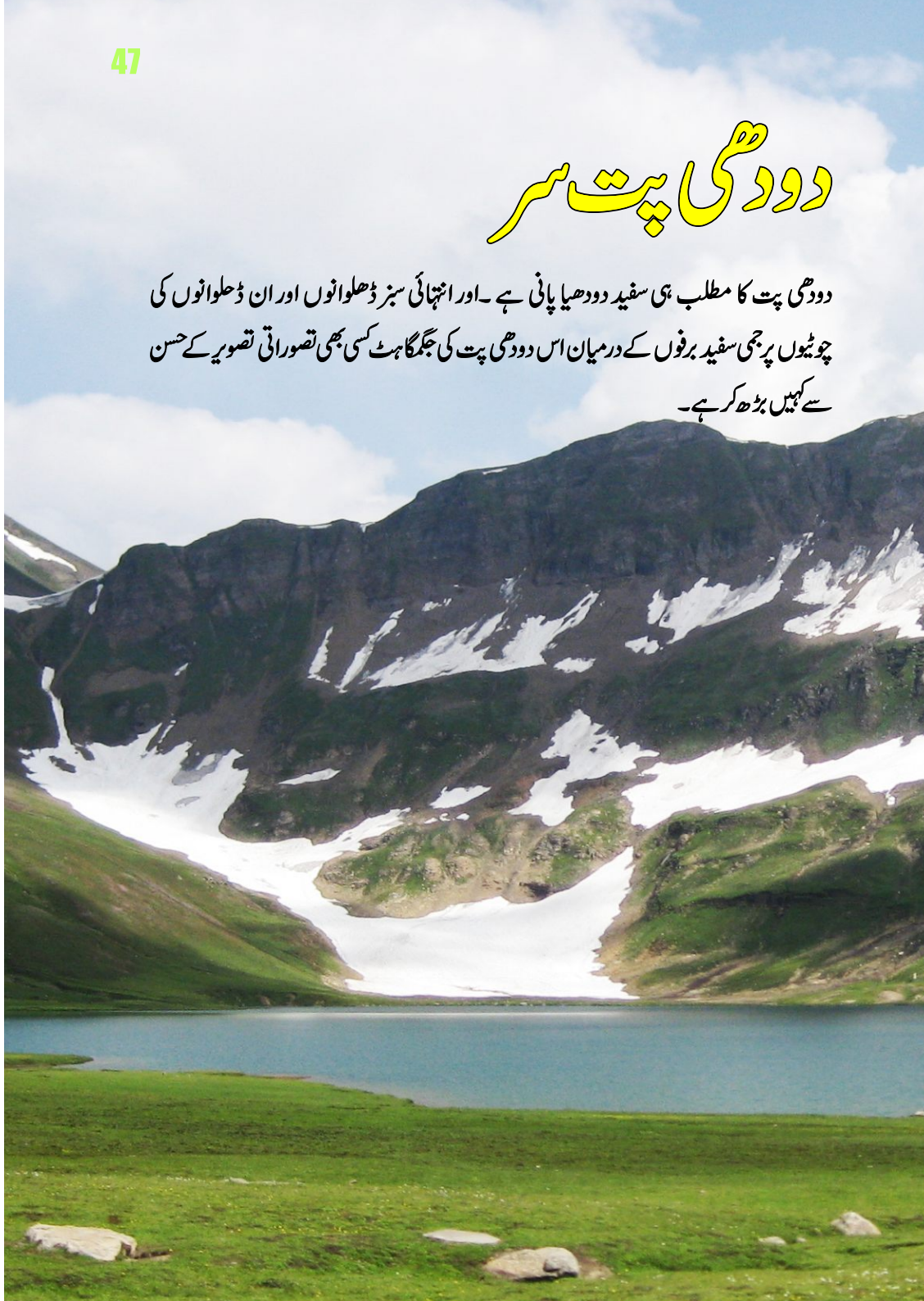

وادی کاغان کی دلفریب ترین جھیل دودھی پت کے بغیر کاغان کا تعارف مکمل نہیں ہوسکتا۔دودھی پت کا مطلب ہی سفید دودھیا پانی ہے ۔اور انتہائی سبز ڈھلوانوں اور ان ڈھلوانوں کی چوٹیوں پر جمی سفید برفوں کے درمیان اس دودھی پت کی جگمگاہٹ کسی بھی تصوراتی تصویر کے حسن سے کہیں بڑھ کر ہے۔قدرت کے پردوں میں پوشیدہ یہ نظارہِ بے مثال حسن نظر، ہمت اور استقامت مانگتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قدرت کی اس لاجواب تخلیق کا نظارہ کرنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔تین ہزار آٹھ سواسی میٹر کی بلندی،طویل عمودی چڑھائیوں اور موسم کی بے اعتباری کے باعث اس جھیل تک جانا ایک مشکل کام ضرور ہے۔لیکن یہ بات طے ہے کہ برف پوش پہاڑیوں اور سرسبز وشاداب ڈھلوانوں کے بیچ شفافیت اور ٹھنڈک کا یہ ذخیرہ اپنی مثال آپ ہے۔

ناران سے کوئی اڑتالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع بیسل کو دودھی پت جھیل کا بیس کیمپ کہا جاسکتا ہے۔بیسل ایک سرد اور پرفضا وادی ہے جہاں قیام اور طعام کا بنیادی بندوبست موجود ہے۔بابوسر ٹاپ جانے والی سڑک کے عین اوپر واقع ہونے اور جھیل لولوسر کی موجودگی کے باعث یہاں سیاحوں کا آنا جانا بھی لگا رہتا ہے۔لولوسر جھیل بیسل سے چند منٹ کی آسان مسافت پر سڑک کے کنارے واقع ہے۔نیلگوں پانی والی یہ جھیل بھی وادی کاغان کی شہرت کی بڑی وجہ ہے۔بھورے پہاڑوں کے اندر تک جاتے پانی اور پانی کی سطح پر تیرتی کشتیوں کے منظر والی یہ جھیل ایک پرراحت اور نسبتا آسان سیاحتی مقام ہے۔اسی جھیل کو کاغان کے یخ بستہ اور مشہور دریائے کنہار کا نقطہ آغاز بھی کہا جاتا ہے۔

بیسل سے دودھی پت سر تک پہنچنے کے لئے تقریباً ایک مکمل دن کی ضرورت ہے۔عموماً یہ راستہ چھ سے آٹھ گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔موسم کی خرابی، لینڈ سلائیڈنگ یا بلندی کی وجہ سے تھکاوٹ کے باعث کبھی کبھار کچھ زیادہ وقت بھی لگ سکتا ہے لہٰذا ضروری سامان کی موجودگی لازم ہے۔بیسل سے دریائے کنہار کو پار کر کے وادی پُر بی نار اور دریائے پُر بی نار تک آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے۔یہاں سے آگے مسلسل چڑھائی اور چٹانی بلندیوں کو ہی راستہ کہا جاتا ہے۔ان دشواریوں کو کسی قدر آسانی سے طے کرنے کے لئے بعض حضرات بیسل سے کرائے کے گھوڑوں کا انتخاب بھی کرتے ہیں۔لگ بھگ چار سے چھ گھنٹوں کی اس جسمانی مشقت اور مستقل مزاجی کے امتحان کے بعد چڑھائی کا یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے۔یہاں ایک وسیع وعریض میدان ہے۔یہ میدان مخملی گھاس اور پانی کی بیسیوں

نالیوں سے پر ہے۔ اکثر مقامات پر دبیز گھاس کے اندر بہتے پانی کا اندازہ بھی نہیں ہو پاتا۔ اس مخملی میدان میں پہنچنے کے بعد باقی کا سفر آسان ہے۔

ایک بڑی مشکل جو اس علاقے میں پیش آسکتی ہے وہ اچانک چھا جانے اور برس پڑنے والے بادلوں کا طوفان ہے۔ اس بلندی پر یہ بارشیں جسم کی رہی سہی طاقت بھی نچوڑ ڈالتی ہیں۔ اس لئے گرم کپڑوں اور برساتیوں کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ بالکل سامنے کافی فاصلے پر یہ میدان سفید اور سبز پہاڑیوں کے ایک دائرے میں بند ہوتا نظر آتا ہے۔ یہی نصف دائرہ دودھی پت کی نشانی ہے۔ اونچے نیچے اس میدان سے گزرتے اور پانی کی نالیوں کو پار کرتے ملا کی بستی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہاں سیاحت کے موسم میں ایک آدھ عارضی کینٹین اور چند رہائشی کیمپ کرائے پر دستیاب ہو سکتے ہیں۔ یہاں تک پہنچنے والے اکثر حضرات یہیں قیام کرتے ہیں اور اگلی صبح جھیل کی طرف روانہ ہوتے ہیں جو یہاں سے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کی آسان مسافت ہے۔

ملا کی بستی میں قیام کرنے کی روایت دودھی پت جھیل کو آلودگی سے بچانے کے لئے بھی نہایت اہم ہے۔ وہ حسین علاقے اور جھیلیں جو سیاحوں کا ہجوم لئے ہوئے ہیں انتہائی آلودگی کا شکار ہیں اور ان کا حسن تیزی سے گہنا رہا ہے۔ دودھی پت سر کی انفرادیت اور تروتازگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اردگرد کیمپنگ اور آلودگی پھیلانے سے مکمل گریز کیا جائے۔ اس کے علاوہ اطراف کی انتہائی شاداب پہاڑیوں اور آنکھوں کو تراوٹ بخشتی گھاس کے میدانوں میں دریا کے کنارے کیمپنگ کے لئے ملا کی بستی ایک آئیڈیل پوائنٹ ہے۔

دودھی پت سر ایک ایسی جھیل ہے جہاں قدرت کا ہر رنگ خالص اور تروتازہ ہے۔ چوٹیوں پر موجود سفید چمکدار برف جھیل کو یخ ترین پانی فراہم کرتی ہے۔ گھاس کی گہری تہہ تا حدِ نگاہ پھیلی ہوئی ہے۔ دور دور تک جھیل میں اترتی ڈھلوانوں پر بھیڑ، بکریوں، گھوڑوں اور خچروں کے ریوڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر نیلا آسمان میسر آئے تو یہ منظر دنیا کے کسی بھی حسین ترین نظارے کو مات کرتا ہے۔ ایک روشن دن اور نیلے آسمان کے ساتھ اس جھیل کو دیکھنے والے خوش قسمت شاید بہت ہی کم ہوں۔ لیکن سرمئی آسمان تلے پھیلی اس جنت نظیر وادی میں اس دودھی جھیل کا منظر بھی ہر لحاظ سے اعلیٰ ترین ہے۔ یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ یہاں تک آنے کی مشقتوں اور کلفتوں کا احساس اس جھیل کو ایک نظر دیکھ کر ہی ختم ہو جاتا ہے۔

پہاڑوں کا ایک رومانوی گاؤں

ہوشے کی سحر انگیزی کی وجہ صرف مشہ بروم ہی نہیں بلکہ یہ قراقرم کے چار نہایت مشہور ٹریکس کا نقطہ آغاز ہے۔ان ٹریکس میں مشہ بروم بیس کیمپ، کے سکس بیس کیمپ اور کے سیون بیس کیمپ ٹریک، نغمہ ویلی اور گونڈوگورو پاس سے کنکورڈیا یعنی کے ٹو بیس کیمپ ٹریک شامل ہیں۔

ہوشے، سات ہزار آٹھ سو اکیس میٹر بلند، دنیا کی چوبیسویں اور پاکستان کی نویں بلند ترین چوٹی مشہ بروم (کے ون) کے سائے میں واقع وہ گاؤں جہاں دنیا بھر کے کوہ نورد اور ایڈونچر کے متلاشی ایک ناقابل بیاں کیفیت کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔

دنیا کے بلند ترین پہاڑی سلسلوں قراقرم، ہمالیہ اور ہندوکش کی بلندیاں آج تک پہلے انسانی قدم کا انتظار کر رہی ہیں۔انہی پہاڑی سلسلوں میں سے سب سے خطرناک سلسلہ قراقرم ہے جو کوہ نوردوں کی رگ و پے میں سنسنی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔سلسلہ قراقرم تبت اور لداخ کے علاقوں سے ہوتا ہوا پاکستان میں داخل ہو کر چین میں ختم ہوتا ہے۔قراقرم میں دنیا کے سب سے بڑے گلیشیر اور خطرناک ترین دریا بھی واقع ہیں ان گلیشیرز میں سیاچن، بالتورو، بیافو، ہسپر، چوگولنگما، پسو، بتورہ اور دیگر بیشمار چھوٹے بڑے گلیشیر شامل ہیں۔ دریاؤں میں سندھ، شیوک، برالڈو، ہنزہ اور گلگت کے پانیوں کا زیادہ تر حصہ قراقرم کی برف پوش چوٹیوں کا ہی مرہون منت ہے۔

اسی سلسلہ قراقرم میں تبت و لداخ کی جانب بلتستان کے ڈسٹرکٹ گنگچھے کا نہایت پسماندہ گاؤں ہوشے ہے۔اپنے مشکل ترمحل وقوع کی وجہ سے ہوشے سیاحوں کی نظروں سے اوجھل ہے۔ ہوشے تک پہنچنے کے لئے آخری قصبہ جہاں تک پختہ سڑک موجود ہے خپلو ہے جو سکردو سے 102 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ہوشے تک پہنچنے کے لئے زبردست جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔خپلو سے ہوشے تک کا فاصلہ 38 کلومیٹر کا ہے جو کہ ناہموار پہاڑی سفر ہے اور جیپ کے ذریعے سے طے کیا جاتا ہے۔بلندی، انتہائی دشوار گزار جیپ روڈ اور شدید موسمی اثرات کا مقابلہ قراقرم کے اس پوشیدہ گوشے کی خصوصیات میں سے ہیں۔تین ہزار چھ سو میٹر کی بلندی پر واقع اس گاؤں میں جولائی جیسے گرم مہینے میں بھی دھوپ کی غیر موجودگی میں گرم کپڑوں کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ہوشے پاکستان کے ان خوبصورت ترین خطوں میں سے ایک ہے جنہیں دیکھنے کے بعد دنیا کے کسی بھی ملک کے باشندے بار بار آنے کی خواہش کرتے ہیں۔ہوشے کی اس سحر انگیز خاصیت کی وجہ صرف مشہ بروم جس کا مطلب بلتی زبان میں برف پوش پہاڑ کا ہے، ہی نہیں بلکہ یہ قراقرم کے چار نہایت مشہور ٹریکس کا نقطہ آغاز ہے۔ان ٹریکس میں مشہ بروم بیس کیمپ، کے سکس بیس کیمپ اور کے سیون بیس کیمپ ٹریک، نغمہ ویلی اور گونڈوگورو پاس سے کنکورڈیا یعنی کے ٹو بیس کیمپ ٹریک شامل ہیں۔ یہ وہ خوابناک نام ہیں جو دنیا بھر میں پہاڑوں کے شائقین کے لئے متبرک سمجھے جاتے ہیں اور

یہاں سے واپس جانے والوں کی آخری شام افسردگی اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیات میں ڈھل جایا کرتی ہے۔

دنیا کے نامور کوہ نورد اس علاقے میں واقع بلند چوٹیوں کو سر کرنے یا ایڈونچر کے شوقین سیاح ان حسین قدرتی نظاروں کو دیکھنے کے لئے کئی کئی دن ان وادیوں، برفوں، دریاؤں اور پہاڑوں میں پیدل سفر کرتے ہیں۔ان سیاحوں اور کوہ نوردوں کی اکثریت دنیا کے مختلف ممالک سے دور دراز کا سفر کر کے اپنے شوق کی تسکین، تحقیقات، مصوری اور تفریح کے لئے اس علاقے کا انتخاب کرتی ہے۔سیاحت کے موسم میں جو کہ عموماً مئی سے شروع ہو کر ستمبر میں ختم ہوتا ہے ان پہاڑوں کے سبزہ زاروں اور وادیوں میں رنگ برنگے خیموں کا میلہ سا دیکھنے کو ملتا ہے۔ دنیا بھر سے سیاح صرف ان پہاڑوں کو دیکھنے کے لئے ان علاقوں میں جمع ہوتے ہیں اور ہمیشہ تازہ رہنے والی یادیں لے کر گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ برف پگھلنے کے بعد اس علاقہ میں رنگ برنگے چھوٹے بڑے پھول، گھاس اور قابلِ کاشت علاقوں میں فصلیں قدرت کے حسن کا دلفریب امتزاج پیش کرتی ہیں۔

ہوشے کا شمار پاکستان کے پسماندہ اور غریب ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔انتہائی دور ہونے، بنیادی سہولیات کی غیر دستیابی، تعلیم و ہنر سے بے بہرہ باشندے اور زمینی و موسمی غیر موزوں زرعی حالات کے باوجود یہاں کے لوگ انتہائی مہمان نواز، شائستہ اور ملنسار ہیں اور اپنی ان خصوصیات کے باعث شمالی علاقہ جات کے "حیران کن مہمان نواز" کہلائے جاتے ہیں۔اپنے کم ترین ذرائع آمدن کے باوجود ان لوگوں میں اپنی مدد آپ کا جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔اس بات کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ گرمیوں کے موسم میں آنے والے سیاحوں کا سامان اٹھانے والے مقامی پورٹر اپنی آمدنی کا دس فیصد حصہ ہوشے کے زیرِ تعمیر سکول کو دیتے ہیں جہاں گاؤں کے تین سو سے زائد بچے تعلیم حاصل کر کے اپنے علاقے کی ترقی و خوشحالی کا ذریعہ بننا چاہتے ہیں۔یہاں پر موجود چند خواندہ اور ذی شعور لوگوں نے مل کر ایک سماجی ادارے کی بنیاد بھی رکھی ہے جس کا کام تعلیم، علاج، سیاحوں کی سہولیات اور دیگر تعمیری سرگرمیوں کا اجراء و ترقی ہے۔مقامی لوگوں کی کوششوں کے علاوہ یہاں بعض ملکی و غیر ملکی تنظیمیں اور ادارے بھی لوگوں کی فلاح و بہبود میں تعاون کر رہے ہیں لیکن یہ تمام کوششیں علاقے کو لوگوں کی ضروریات کے لئے ناکافی ہیں۔

ہوشے میں سال میں صرف دو فصلیں پیدا ہوتی ہیں جو کہ پتھریلی زمین، تیز ہواؤں اور موسمی تغیرات، آلاتِ

زراعت کی کمیابی اور کم تر افرادی قوت کی وجہ سے مقامی ضروریات کے لئے بھی ناکافی ہیں۔انتہائی بلند پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں تک رسائی کا واحد راستہ بھی لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے اکثر بند رہتا ہے جبکہ کئی دفعہ شدید لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے بے شمار گھر تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ بلندی کی وجہ سے یہاں پھلوں یعنی خوبانی، اخروٹ اور چیری وغیرہ کی پیداوار بھی نہیں ہے۔ پالتو جانور یہاں کے لوگوں کے لئے اہم ترین ذریعہ آمدن ہیں۔ ان جانوروں میں بھیڑ بکریاں، گائیں، یاک اور زوہ شامل ہیں۔جنگلی جانوروں میں مارخور، برفانی چیتا، مارموٹ اور مختلف رنگوں کے خوبصورت پرندے اس علاقے کی شہرت کا خاص سبب ہیں۔

سیاحت گزشتہ کئی عشروں سے یہاں کی اہم ترین صنعت رہی ہے یہاں کے زیادہ تر مرد سیاحوں کی رہنمائی اور سامان کی مزدوری کے ذریعے اپنا روزگار حاصل کرتے ہیں اور اپنی جفاکشی اور خوش خلقی کی وجہ سے ملکی و غیر ملکی سیاحوں میں شہرت رکھتے ہیں۔لیکن گزشتہ چند برسوں میں آنے والی تبدیلیوں، سیاحت کے عدم فروغ اور پاکستان کے دیگر حصوں میں سیاحت سے غیر رغبتی کی وجہ سے ان علاقوں کے رہنے والوں کے ذرائع آمدن میں خاصی کمی واقع ہوئی ہے۔

تاؤبٹ

تاؤبٹ میں قدرتی حسن کے شاہکار اجزا حسین ترین توازن کے ساتھ خالص ترین رنگوں میں ایک وسیع و کشادہ کینوس پر تخلیق کیے گئے ہیں۔ اس شاہکار منظر کا حصہ بن کر اور جیتی جاگتی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرنا کسی بھی بیان اور تصور کا نعم البدل نہیں ہوسکتا۔

تاؤبٹ کسی شخصیت کا نہیں بلکہ پاکستان کی سب سے خوبصورت وادی کا نام ہے!

وادی نیلم کے انتہائی شمال میں واقع یہ وادی ان علاقوں میں سے ہے جس کی کسی بھی زاویے سے لی گئی تصویر قدرتی حسن کا ایک شاہکار قرار پاتی ہے۔ گھنے جنگلات کی بات ہو یا سرسبز ہموار میدانوں کی، نیلگوں پانیوں کا تذکرہ ہو یا پرتسکین موسم کا خیال، تاؤبٹ ہر تصور سے زیادہ حسین مقام ہے۔

مظفر آباد، شاردہ یا کیل سے جیپ کے ذریعے ہی اس جنت نظیر وادی تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مظفر آباد سے تاؤبٹ تک ایک طویل سفر ہے جو دس سے بارہ گھنٹے تک لے سکتا ہے۔ شاردہ وادی نیلم کا سیاحتی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پرفضا اور خوبصورت مقام ہے۔ مظفر آباد کے علاوہ کاغان سے بھی جیپ کے ذریعے براستہ درہ نوری نار شاردہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ دور دراز سے آنے والے سیاحوں کے لئے شاردہ میں قیام کی ہر ممکن سہولت دستیاب ہے۔ یہاں سے وادی نیلم کے تمام علاقوں بشمول تاؤبٹ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ وادی نیلم میں کھانے کا معیار اور ذائقہ پاکستان کے دیگر سیاحتی مقامات سے کہیں بہتر ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ بھیڑ بھاڑ نا ہونے کے باعث یہاں ہوٹلوں کے کرائے بھی کم ہیں اور کھانے پینے کی اشیاء بھی معمول کے داموں دستیاب ہیں۔ ان بہت سی خصوصیات کے باعث وادی نیلم فرصت کے دن گزارنے اور سیاحت کے لئے بہترین انتخاب ہے۔

شاردہ سے کیل کے راستے تاؤبٹ تک چار سے چھ گھنٹے میں پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ تمام راستہ دریائے نیلم کے کنارے اور گھنے جنگلات سے بھرپور ہے۔ موسم خوشگوار اور جگہ جگہ پہاڑی ندیاں نالے اور ان گنت آبشاریں ہر لمحہ اپنی طرف متوجہ رکھتی ہیں۔ وادی نیلم کا اصل حسن کیل سے آگے شروع ہوتا ہے۔ یہاں جنگلات ناقابل بیان حد تک گھنے ہیں۔ راستے کے ساتھ متعدد آبشاریں پھوار اڑاتی ہیں اور گہرائی میں دریا خوابناک حد تک شفاف ہے۔ اس راستے پر ممکنہ پڑاؤ کے مقامات جان وئی، سرداری اور ہلمت ہیں۔

جان وئی چاروں اطراف سے گھنے جنگلات سے لبریز پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ بادلوں کی موجودگی میں یہ گھنے جنگل کی تنگ وادی دھند میں لپٹ جاتی ہے۔ ایسے میں جان وئی ہمیشہ کے لئے یادوں میں بس جانے والے ایک خوابناک منظر میں ڈھل جاتا ہے۔ جان وئی میں کھانے اور رہائش کے لئے لکڑی سے بنا ایک ہی ہوٹل ہے جہاں رہائش اور خوراک کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ جانوئی کے بعد ہلمت کا حیران کن خوبصورت علاقہ شروع ہوتا ہے۔

بائیں جانب کے سرسبز پہاڑ سے لیکر گہرائی میں دریائے نیلم اور اس کے دونوں طرف شاداب گھاس سے لبریز میدان قدرت کی تخلیق کا ایک ناقابل بیان نمونہ ہیں۔ یہاں دریا بھی ایک روانی سے بہتا ہے اور سکون و راحت کی ایک کیفیت دیکھنے والوں پر بھی طاری ہو جاتی ہے۔

ہلمت کے گاؤں بھی ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ لکڑی سے تعمیر کردہ اور چھتوں تک پر لکڑی کے ترچھے شہتیر، چھتوں کی چمنیوں سے نکلتا دھواں اور ان مکانوں کے اردگرد کے سرسبز کھیت! نیلے آسمان، درختوں سے گھری پہاڑیوں اور دریائے نیلم کے پس منظر میں یہ منظر شاید ہی کسی اور جگہ دستیاب ہو۔ اس منظر کے متعدد گاؤں اس راستے میں دکھائی دیتے ہیں اور انہیں نظاروں میں تاؤبٹ کا آغاز ہوتا ہے۔

تاؤبٹ بھی قریب قریب انہیں تمام قدرتی اجزا پر مشتمل ہے جو تمام راستے مختلف مقدار اور تراکیب سے نت نئے مناظر کی شکل میں ڈھلتے رہے ہیں۔ تاؤبٹ میں یہ تمام شاہکار اجزا حسین ترین توازن کے ساتھ خالص ترین رنگوں میں ایک وسیع و کشادہ کینوس پر تخلیق کئے گئے ہیں۔ اس شاہکار منظر کا حصہ بن کر اور جیتی جاگتی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرنا کسی بھی بیان اور تصور کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔

تاؤبٹ پہنچ کر دریائے نیلم قدرے دور ہو جاتا ہے۔ اس کی جگہ ایک شفاف ندی اور اس کے پس منظر میں گہرے سبز جنگلات والی بلندیاں ماحول پر چھائی ہوئی ہیں۔ ندی پر بنائے گئے لکڑی کے ایک خوبصورت پل سے دریائے نیلم کے کنارے پہنچنے کے لئے چند منٹ کا فاصلہ ہے جو پیدل طے ہوتا ہے۔ لکڑی کے چند گھروں، آلوؤں کے کھیتوں اور کچے راستے سے ہوتے ہوئے دریائے نیلم تک یہ ایک آسان فاصلہ ہے۔ رنگارنگ پھولوں اور گھاس کے قالین سے مزین کہیں ہموار اور کہیں اونچے نیچے میدان کی شکل میں دریا کا یہ کنارا کیمپنگ اور آرام کے لئے بہترین جگہ ہے۔ اعصاب کو سکون اور دل و دماغ کو تر تازہ کر دینے والی ہواؤں، دریا کے پانی کی مترنم آوازوں اور پرندوں کی چہچہاہٹوں کے ساتھ آلودگی سے دور تاؤبٹ میں انسانی محسوسات پر چھا جانے والی تمام خصوصیات موجود ہیں۔

تاؤبٹ میں روایتی انداز میں لکڑی سے بنا ایک ہوٹل اور ایک دکان موجود ہے جو رہائش اور خوراک کی ضروریات کے لئے مددگار ہو سکتا ہے۔ وادی نیلم اور تاؤبٹ تک آنے کے لئے تمام لوگوں کو اپنی شناخت کے لئے قومی شناختی

کارڈ لازمی طور پر ساتھ رکھنا چاہئے۔ چونکہ وادی نیلم کے اکثر علاقے لائن آف کنٹرول پر واقع ہیں اس لئے مقبوضہ علاقوں سے کسی ناخوشگوار واقعے یا بلا اشتعال کاروائی کے نتیجے میں یہاں آمد ورفت تعطل کا شکار بھی ہوسکتی ہے۔ اٹھمقام، کیرن، دواریاں اور بعض دیگر علاقے اس حوالے سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ ایسے حالات میں حفاظتی نقطہ نگاہ سے وادی نیلم کا سفر مناسب نہیں۔

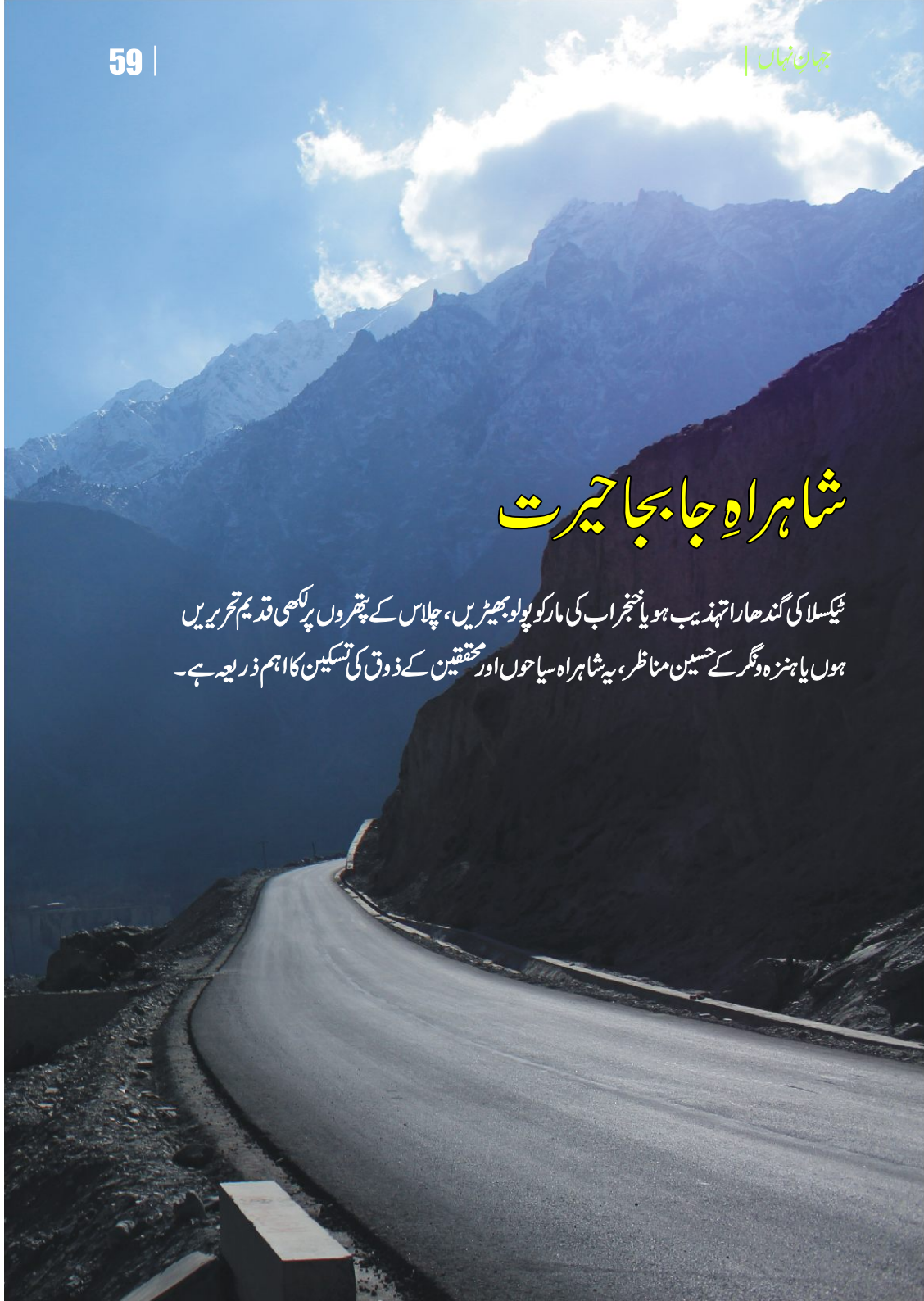

شاہراہِ جا بجا حیرت

ٹیکسلا کی گندھارا تہذیب ہو یا خنجراب کی مارکوپولو بھیڑیں، چلاس کے پتھروں پر لکھی قدیم تحریریں ہوں یا ہنزہ ونگر کے حسین مناظر، یہ شاہراہ سیاحوں اور محققین کے ذوق کی تسکین کا اہم ذریعہ ہے۔

حسن ابدال تا کاشغر۔1300 کلومیٹر طویل یہ شاہراہ نا صرف پاکستان اور چین کے درمیان تجارتی رابطوں کا اہم ترین ذریعہ ہے بلکہ گلگت بلتستان کے دور افتادہ علاقوں کو وفاقی دارالحکومت اور دیگر شہروں سے ملانے کے ساتھ ساتھ ملک کے حسین ترین پہاڑی اور تاریخی مقامات تک پہنچنے کا واحد زمینی راستہ بھی ہے۔ ٹیکسلا کی گندھارا تہذیب ہو یا خنجراب کی مارکوپولو بھیڑیں، چلاس کے پتھروں پر لکھی قدیم تحریریں ہوں یا ہنزہ ونگر کے حسین مناظر، یہ شاہراہ سیاحوں اور محققین کے ذوق کی تسکین کا اہم ذریعہ ہے۔

پاکستان اور چین کے انجنیئر وں اور محنت کشوں کی شبانہ روز محنت و جرات کا یہ وہ انمول نمونہ ہے جسے دیکھ کر دنیا کا کوئی بھی شخص حیرت کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ گنا جاتا ہے۔ عظیم اور دشوار ترین پہاڑوں کے درمیان اس عجوبے کی تعمیر کے دوران چار سو سے زائد مزدوروں اور انجنیئر وں کی جان ایک عظیم مقصد کی نذر ہوئی۔ موسموں کے اتار چڑھاؤ، شدید ترین برف باری اور لینڈ سلائیڈنگ کے ہمہ وقت خطرے کے باوجود اس سڑک کا بنایا جانا اور برقرار رکھنا حقیقتاً ایک معجزہ ہی ہے اور اس معجزے کو ممکن بنانے میں ایف ڈبلیو او کے ماہرین اور کارکنوں کا کردار قابل تحسین ہے۔

وفاقی دارالحکومت اسلام آباد سے پونے گھنٹے کی مسافت پر حسن ابدال کے قریب جی ٹی روڈ سے ایک سڑک ایبٹ آباد کی طرف نکلتی ہے اور یہی اس شاہکار شاہراہ کا نقطہ آغاز ہے۔ ٹیکسلا کے مشہور کھنڈرات یہاں سے صرف پندرہ منٹ کی مسافت پر واقع ہیں۔ قبل مسیح کی بدھ مت تہذیب کی ان یادگاروں کو دنیا کے اہم ثقافتی ورثے میں شمار کیا جاتا ہے۔ جولیاں، سرکپ اور بھڑ ماؤنڈ وغیرہ کے ان کھنڈرات کی سیاحت انسانی تاریخ کے عروج و زوال، تہذیب وثقافت اور فن تعمیر کی فراموش شدہ داستانوں سے آشنا کرتی ہے۔ مہاتما بدھ اور دیگر شخصیات کے مجسموں سے لے کر عام گھریلو برتنوں اور تعمیرات کی باقیات تک ہر ہر چیز گزشتہ اور موجودہ دور کے انسان کی سوچ، رہن سہن، ضروریات، رسوم ورواج اور علوم وفنون کے درمیان موازنہ فراہم کرتی ہے۔

شاہراہ قراقرم کا آغاز ضلع ہزارہ میں ہے۔ ہزارہ کے ہرے بھرے نظارے اور بارونق آبادیاں آپ کا ساتھ تھاکوٹ تک دیتے ہیں۔ تھاکوٹ سے پہلے ہری پور، حویلیاں، ایبٹ آباد اور مانسہرہ میں سے گزرتے ہوئے ایک پرفضا علاقے کا خوابناک تصور حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔ مانسہرہ سے ناران اور کاغان کے لئے ایک سڑک

الگ ہوجاتی ہے جو ان حسین وادیوں تک رسائی کو ممکن بناتی ہے۔ تھاکوٹ سے عظیم دریائے سندھ بل کھاتا ہوا شاہراہ قراقرم کے ساتھ ساتھ گلگت تک چلتا ہے۔ تھاکوٹ کے مشہور طویل پل سے گزرتے ہوئے دریائے سندھ اپنی وسعت اور عظمت کے ساتھ آپ کے سامنے ہے جو آپ کے بائیں طرف پہاڑیوں کے پیچھے دنیا کے سب سے بڑے ڈیم تربیلا کو پانی کا ذخیرہ فراہم کررہا ہے۔ یہاں سے آگے اکثر مقامات پر دریائے سندھ اور سڑک کے درمیاں گہرائی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ یہ عظیم دریا نیچے بہت ہی نیچے گہرائی میں صرف ایک لکیر کی شکل میں نظر آتا ہے۔

بشام شاہراہ قراقرم پر اہم مقام ہے جو تھاکوٹ سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ بشام ضلع سوات میں ہے اور چینی مصنوعات کا ایک تجارتی مرکز کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے آباد اس مقام سے براستہ شانگلہ سوات کے دیگر قابل دید مقامات تک رسائی ممکن ہے۔ بشام سے گردوپیش کے کوہستانی علاقے کا نظارہ دریائے سندھ کے ساتھ ایک دلآویز منظر پیش کرتا ہے۔

بشام سے آگے چلیں تو دریائے سندھ کے دونوں طرف آباد ضلع کوہستان کے لوگ بازاروں میں اپنے روایتی لباس اور روزمرہ کے کاموں میں مشغول میں نظر آتے ہیں۔ کوہستان کا علاقہ بھی حسین قدرتی مناظر سے لبریز ہے اور لکڑی سے بنے گھر اور دوکانوں کو دیکھ کر سردی کے موسم میں یہاں ٹھنڈ کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کوہستان کے اکثر مقامات پر لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے شاہراہ قراقرم کو نقصان پہنچتا رہتا ہے اور سڑک بھی بند ہوجاتی ہے لیکن ایف ڈبلیو او کے جوان کم وقت میں روڈ کو استعمال کے قابل بنا دیتے ہیں۔ کوہستان میں جگہ جگہ دور بلندیوں سے اترتی پانی کی ندیاں سفر کو یادگار اور دلچسپ بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

کوہستان کے بعد چلاس کا آغاز ہوتا ہے۔

چلاس کا علاقہ خشک اور بنجر پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ بلندیوں میں اور پہاڑوں کے اندر مختلف جگہوں پر سرسبز چراہ گاہیں موجود ہیں جہاں درختوں کی بھی بہتات ہے لیکن شاہراہ قراقرم کے ساتھ چلاس کا علاقہ سنگلاخ پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ یہاں قبل مسیح کے دور میں پتھروں پر کھدائی کر کے بنائی گئی مختلف تصاویر اور اشکال وغیرہ موجود ہیں۔ یہ اشکال اس تاریخی راستے سے گزرنے والے تاجروں، فوجیوں اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں نے بنائی تھیں۔

انسانوں اور جانوروں کی تصویروں، تکونی اور گول اشکال سے مزین یہ چٹانیں بہت سے لوگوں کے لئے دلچسپی کا مرکز ہیں۔ چلاس کو دیامر بھی کہا جاتا ہے اور اسکی وجہ دیامر نامی وہ بلند پہاڑی چوٹی ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ نانگاپربت کے نام سے عام طور پر جانی جانے والی اس چوٹی کا نام دنیا بھر کے سیاحوں کے لئے دلچسپی کا حامل ہے۔ دنیا کے بلندترین پہاڑوں میں اس کا نمبر نواں ہے لیکن خطرناکی کے لحاظ سے یہ دنیا کی سب سے خطرناک اور مشکل چوٹی ہے۔ اس چوٹی کا مقامی نام دیامر ہے اور یہ تمام علاقہ اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ شاہراہ قراقرم سے اس چوٹی کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ رائی کوٹ کا پل اس سڑک پر ایک مشہور مقام ہے اور یہاں سے نانگاپربت اور فیری میڈوز کے لئے جیپیں تقریباً ہر وقت مل سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نانگاپربت شاہراہ قراقرم کی شہرت کو چار چاند لگانے میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

چلاس یا دیامر کے بعد گلگت ڈویژن کا آغاز ہوجاتا ہے۔ جگلوٹ شاہراہ قراقرم پر آباد ایک اہم مقام ہے جہاں سے استور، دیوسائی ہلتستان اور نانگاپربت کے لئے عازم سفر ہوا جاسکتا ہے۔

جگلوٹ کے مقام پر ہی عین شاہراہ قراقرم پر ایک ایسا مقام ہے جہاں دنیا کی تین عظیم ترین پہاڑی سلسلے اکٹھے ہوتے ہیں۔ ایک سفید رنگ کی یادگار اس جگہ پر قراقرم، ہمالیہ اور ہندوکش کے ملاپ کی نشاندہی کے لئے تعمیر کی گئی ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے اس مقام پر کھڑے ہوکر آپ تینوں پہاڑی سلسلوں کو بیک وقت دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں سے ایک سڑک جو گلگت سکردو روڈ کے نام سے جانی جاتی ہے، شاہراہ قراقرم سے الگ ہوکر ہلتستان کی طرف جاتی ہے جہاں ان گنت مقامات ایڈونچر اور پہاڑوں کے شائقین کا انتظار کررہے ہیں۔

گلگت شمالی علاقہ جات کا صدر مقام اور ایک خوبصورت پہاڑی شہر ہے۔ اپنی سیاحتی، تجارتی اور معاشرتی خصوصیات کے باعث اس شہر کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔ شاہراہ قراقرم سے گلگت شہر کا فاصلہ چند کلومیٹر کا ہے اور یہاں سے بے شمار خوبصورت علاقے آپ کی پہنچ میں ہیں۔ نلتر، اشکومن، غذر، یاسین، شندور اور دیگر بہت سے علاقے گلگت میں شامل ہیں اور بذریعہ جیپ آپ ان تمام علاقوں کی سیاحت کرسکتے ہیں۔

گلگت سے کچھ دیر کے فاصلے پر نگر کا آغاز ہوجاتا ہے۔ راکاپوشی نگر کی پہچان ہے اور یہ عظیم الشان چوٹی شاہراہ قراقرم پر جگہ جگہ پہاڑوں کے پیچھے سے اپنا جلوہ دکھاتی رہتی ہے۔ نگر اور ہنزہ آمنے سامنے شاہراہ قراقرم کے

دونوں طرف آباد ہیں اور آبشاروں، گلیشیئر وں، پہاڑی چوٹیوں اور دریاؤں کی بہتات کے باعث ایک لمحہ بھی سیاحوں کی توجہ اپنے اوپر سے ہٹنے نہیں دیتے۔ راکاپوشی، دستگیل سر، کنیانگ کش، التر، بتورہ، پسو اور دیگر بہت سی چوٹیاں، بتورہ اور پسو کے طویل گلیشیئر اور ہنزہ، خنجراب اور کئی چھوٹے دریا اس شاہراہ کی خوبصورتی میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔

سوست، ہنزہ کا وہ حصہ ہے جو انتظامی طور پر پاکستان اور چین کے درمیان بارڈر کا کام کرتا ہے۔ یہاں چین سے درآمد شدہ اشیاء کی بہت بڑی مارکیٹ ہے اور بہت سے امپورٹرز اور ایکسپورٹرز یہاں مصنوعات کے تبادلہ کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

سوست سے آگے خنجراب تک کا سفر بالکل بے آباد ہے اور دشوار پہاڑوں اور مسلسل چڑھائی پر مشتمل ہے۔ خنجراب کے مقام پر شاہراہ قراقرم کی بلندی 4800 میٹر تک پہنچ جاتی ہے جہاں اسے دنیا کی بلند ترین عوامی شاہراہ ہونے کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ درہ خنجراب تمام سال برف سے ڈھکا رہتا ہے اور دور تک بلند پہاڑ سفید چادر اوڑھے نہایت حسین منظر پیش کرتے ہیں۔ مئی سے لیکر اکتوبر تک اس سڑک پر تجارت اور سفر جاری رہتا ہے جبکہ باقی تمام مہینوں میں یہ شاہراہ شدید برف کی وجہ سے بند کر دی جاتی ہے۔

خنجراب کی ایک اور خصوصیت ایک بہت بڑے علاقے کو خنجراب نیشنل پارک کی حیثیت ملنا بھی ہے۔ یہاں دنیا کے چند منفرد اور معدوم ہوتی ہوئی جنگلی حیات موجود ہے جس میں مارکوپولو بھیڑیں، برفانی چیتے اور نیل گائے وغیرہ شامل ہیں۔ دیگر جنگلی حیات میں، مارموٹ، بھیڑیا، بھورے ریچھ، یاک اور مارخور وغیرہ شامل ہیں۔ خنجراب کا سفر ایک نہایت یادگار اور دلچسپ سفر ہے جس کی مثال کسی بھی دوسرے سفر کے ساتھ نہیں دی جا سکتی۔

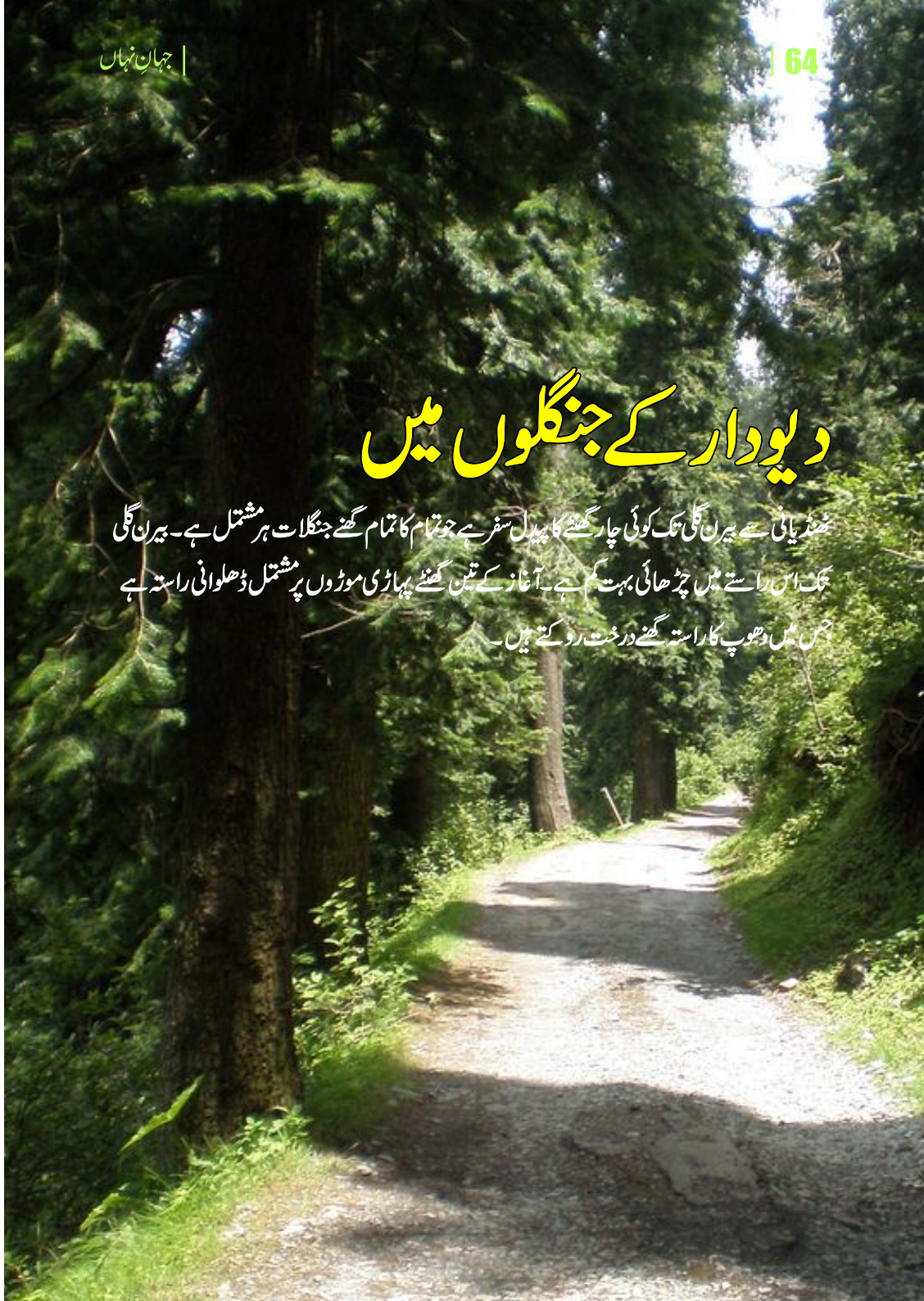

دیودار کے جنگلوں میں

ٹھنڈیانی سے بیرن گلی تک کوئی چار گھنٹے کا پیدل سفر ہے جو تمام کا تمام گھنے جنگلات ہر مشتمل ہے۔ بیرن گلی تک اس راستے میں چڑھائی بہت کم ہے۔ آغاز کے تین گھنٹے پہاڑی موڑوں پر مشتمل ڈھلوانی راستہ ہے جس میں دھوپ کا راستہ گھنے درخت روکتے ہیں۔

وہ اپریل کا وسط تھا جب بیٹھے بٹھائے چند دوستوں نے فیصلہ کیا کہ ٹھنڈیانی سے نتھیا گلی کے درمیان ایک انتہائی گھنے جنگل اور نہایت ہی خوبصورت مناظر سے بھرپور ٹریک پر نکلا جائے۔

میرا جانی کی بلند چوٹی اور علاقے کے سحر انگیز تذکروں نے چار دوستوں کو فی الفور ٹریک پر نکلنے کے لئے آمادہ کر دیا تھا۔

ایک دن چھوڑ کر ہم نے پنڈی سے ایبٹ آباد کی گاڑی پکڑی اور ڈھائی گھنٹے بعد ایبٹ آباد کے مرکزی اڈے میں جا اترے۔ یہاں سے ٹھنڈیانی کی سوزوکی کی تلاش شروع کی۔ گاڑی کا بندوبست ایبٹ آباد میں کوئی مشکل نہیں کیونکہ اڈے سے ہی آس پاس کے تمام علاقوں کی گاڑیاں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ ہزارہ کے تمام علاقوں میں بھی سوزوکی لوڈنگ گاڑیاں ہی سفری ضروریات کے لئے بھی استعمال ہوتی ہیں۔ ایک ڈرائیور سے مول تول کے بعد ہم سامان سمیت گاڑی میں سوار ہو گئے۔ چونکہ وقت پر گاڑی مل گئی تھی لہٰذا توقع تھی کہ وقت پر ٹھنڈیانی پہنچ کر وہاں سے اپنی پہلی منزل تک بروقت پہنچا جا سکتا ہے۔

گاڑی چلی اور بائیں ہاتھ مڑ کر ایک نامعلوم چڑھائی کا آغاز ہو گیا۔

اس سے قبل جتنی مرتبہ بھی ٹھنڈیانی کا سفر کیا تھا اس میں یہ راستہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خیال ہوا کہ شاید ڈرائیور کسی اور سمت سے مری روڈ اور پھر ٹھنڈیانی جانے والی سڑک کی طرف جا نکلے گا۔ کوئی پندرہ منٹ کی چڑھائی چڑھ کر گاڑی ایک طرف رک گئی۔

اترے اور ڈرائیور سے دریافت کیا کہ بھائی کیا ارادہ ہے؟

کہنے لگا کہ میرا گھر ٹھنڈیانی کے راستے میں آتا ہے اور میرے بچے یہاں سکول میں پڑھتے ہیں۔ میں چند منٹ میں انہیں لے کر آتا ہوں کیونکہ آپ کو ٹھنڈیانی پہنچا کر میں واپس نہیں آ سکوں گا۔

''تو بھائی پہلے بتایا ہوتا، ہم تو جلد از جلد ٹھنڈیانی پہنچ کر آگے جانا چاہتے ہیں۔''

''اوہ جی مجھے کیا پتا کہ آپ نے کہیں آگے جانا ہے۔ وہاں سے آگے کون جاتا ہے؟ میرا خیال تھا کہ آپ کسی ہوٹل میں رکیں گے اور تھوڑی سی دیر سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' ڈرائیور کی بے نیازی بھی قابل دید تھی۔

سوچا آئندہ کسی بھی سفر میں نکلنے سے پہلے ان ڈرائیور حضرات کو اپنا مکمل منصوبہ بمع جزئیات سمجھایا جائے اور اگر ان

کا کوئی ذاتی مفاد مزاحم ہو تو اس کی مناسبت سے پلان میں تبدیلی کر لی جائے۔ اب یہ ضروری تو نہیں کہ ڈرائیور آپ سے معاملہ طے کرنے کے بعد صرف آپ کی مرضی کے مطابق چلے۔ ڈرائیور کسی نامعلوم سمت میں غائب ہو چکا تھا اور ہم ایک نامعلوم پہاڑی پر تھے۔ بہر حال مجبوری کے تحت اس خوبصورت پہاڑی کی بلندیوں سے ایبٹ آباد کا منظر دیکھنے لگے۔ قریب سے گزرتے ایک صاحب کو دیکھ کر اس جگہ کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ شملہ پہاڑی ہے اور ایبٹ آباد کی مشہور جگہ ہے۔

کوئی پون گھنٹے بعد ڈرائیور صاحب اپنے دو فرزندان کے ساتھ ایک موڑ سے نمودار ہوئے اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گئے۔

بچے بھی اگلی سیٹوں پر بیٹھے اور ہم خون کے گھونٹ پیتے گاڑی کی پچھلی نشستوں پر لد گئے۔

گاڑی واپس مڑی اور تیزی سے اترائی اترتی ہوئی ایبٹ آباد کی مرکزی سڑک اور پھر دائیں ہاتھ مڑ کر نواشہر کے علاقے سے ہوتی ہوئی مری روڈ پر آ گئی۔ یہاں سے چند کلومیٹر بعد بائیں ہاتھ پر ٹھنڈیانی جانے والی سڑک کا آغاز ہوتا ہے۔

جلد ہی ہم ٹھنڈیانی کے راستے پر تھے۔ کچھ ہی دیر میں ایک موڑ مڑنے کے بعد گاڑی پھر رکی۔ سوزوکی میں سفر کرنے والوں کو اچھی طرح اندازہ ہو گا کہ اس سواری میں آپ پچھلی سیٹوں پر بیٹھ کر گاڑی کے پیچھے کی سمت سے باہر دیکھتے ہیں اور آگے کا منظر نظر نہیں آتا۔ خیر باہر نکل کر دیکھا تو یہ ایک خوبصورت جگہ تھی۔ بائیں طرف کے طویل پہاڑی سلسلے سے ایک شفاف ٹھنڈے پانی کا چشمہ آ رہا تھا اور سبزہ وشادابی تو ایبٹ آباد اور تمام ملحقہ علاقوں میں ہر جگہ ہے ہی۔

چشمے کے کنارے ٹین اور لکڑی پر مشتمل ایک ٹوٹا پھوٹا سا کھوکھا تھا جہاں ایک کڑاہی میں آلو کے پکوڑے اور تیل کے چولہے پر سیاہ رنگ کی چائے کی دیگچی نظر آ رہی تھی۔ یہ جگہ غالباً ایک روایتی سفری آرام کے پڑاؤ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ جتنی مرتبہ بھی یہاں سے گزرے ہمیشہ گاڑی چند منٹ کے لئے یہاں ضرور رکی۔ ڈرائیور حضرات گاڑی میں ٹھنڈا پانی ڈالتے ہیں اور مسافر پیٹ میں چند پکوڑے اور چائے۔

ہم نے بھی روایات کی خلاف ورزی مناسب نا سمجھی۔

ایبٹ آباد کے پکوڑے اپنے ذائقے اور اجزائے ترکیبی کے باعث پاکستان میں سب سے مزیدار پکوڑے ہیں۔ ان پکوڑوں کا اصل مرکز تو ایبٹ آباد کی مشہور تاریخی الیاسی مسجد کے گرد و نواح میں واقع دوکانیں ہیں۔ جہاں کئی کئی بوری آلو روزانہ پکوڑوں کی شکل میں فروخت ہوتا ہے۔ کھولتی کڑھائی سے نکلے ان گرم گرم پکوڑوں کا سواد صرف ایبٹ آباد میں ہی ہے۔ خیر ٹھنڈیانی کے راستے میں اس کھوکھے کے پکوڑے بھی خوش ذائقہ تھے اور چٹنی اور گرم چائے کے ساتھ یہ ایک پر لطف ٹی بریک تھی۔

اب سفر شروع ہوا تو گاڑی تھی اور گاڑی کا امتحان تھا۔

ٹھنڈیانی کی عمودی چڑھائی، پے در پے موڑ اور گہری کھائیاں۔ ٹھنڈیانی تک گاڑی لے کر جانا بھی ہر ڈرائیور کے بس کی بات نہیں۔ کہیں چڑھائی کا زاویہ کم ہوتا تو گاڑی کی رفتار کچھ تیز ہوتی اور پھر کسی موڑ سے شروع ہونے والی تند چڑھائی پر گیئر ڈاؤن اور گاڑی کی رفتار نا ہونے کے برابر ہو جاتی۔ راستے میں چھوٹے بڑے گاؤں اور آبادیوں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ ایسی ہی ایک آبادی میں ڈرائیور نے اپنے بچوں کو اتارا اور بلاتا خیر چل پڑا۔

کچھ دیر بعد ہم اس جگہ پہنچے جہاں پہاڑوں کو توڑ کر پتھر اور پھر ان پتھروں سے بجری بنانے والی کرشنگ مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ یہاں ہر وقت گرد و غبار چھایا رہتا ہے اور کبھی کبھار جب ڈائنامائیٹ سے پہاڑوں کو توڑا جاتا ہے تو یہ غبار شدید ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر گاڑیوں کو کچھ دیر کے لئے روک دیا جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے اس وقت راستہ کھلا ہوا تھا لہٰذا گاڑی رکے بغیر وہاں سے گزر گئی۔

جوں جوں بلندی بڑھ رہی تھی درخت زیادہ اور سبزہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ڈھلوانوں میں سبزہ اور چیڑھ کے درخت۔ منظر خوبصورت اور دوستوں کی خوش گپیاں۔ تھوڑی دیر میں چیڑھ کے درختوں کی جگہ دیودار کے درختوں نے لے لی اور منظر کے سحر میں مزید اضافہ ہو گیا۔ موسم کی خوشگواریت اور ماحول کی دلفریبی مزاج پر رفتہ رفتہ اپنا تاثر قائم کر رہی تھی۔

ایبٹ آباد سے چلے ہمیں لگ بھگ ڈھائی گھنٹے ہو چکے تھے۔ اور اب پون گھنٹے تک ہمیں ٹھنڈیانی پہنچ جانا چاہئے تھا۔ گھنے جنگلات، گھاس کے مخملیں فرش اور رنگ برنگے پھولوں کے درمیان اس موڑ مڑتی سڑک پر چلتے بالآخر ہم ٹھنڈیانی میں داخل ہوئے۔ چھوٹے بڑے اقامتی ہوٹلوں سے کچھ آگے جا کر گاڑی رک گئی۔

ہر طرف کا منظر مبہوت کر دینے والا تھا۔

ٹھنڈیانی دراصل اس پہاڑ کا نام ہے جس پر اس وقت ہم کھڑے تھے۔اس کی بلندی ستائیس سو میٹر سے کچھ زیادہ ہے۔اس بلند مقام سے اردگرد کی بلندیوں اور ڈھلوانوں پر سیاہی مائل سبز جنگلات یہاں سے ایک عجب منظر پیش کر رہے تھے۔ یہ جنگل اس قدر گھنے ہیں کہ اکثر جگہ تو سورج کی روشنی بھی زمین تک نہیں پہنچ پاتی۔اس وجہ سے درختوں کے نیچے اور سایہ دار جگہوں پر گرمیوں کے موسم میں بھی سفید برف جمی رہتی ہے اور گھنے درختوں کے بیچ میں دور سے چمکتی نظر آتی ہے۔

یہاں پختہ سڑک ختم ہوگئی تھی اور آگے کچا پتھریلا راستہ تھا جو ایک موڑ کے پیچھے گم ہو رہا تھا۔سامان لے کر ہم آگے بڑھے اور کچے راستے کے ایک طرف لکڑی سے بنے ایک ہوٹل کے باہر رک گئے۔صبح سے اب تک چونکہ مسلسل سفر میں تھے اس لئے یہاں سے کچھ کھانے پینے اور کچھ دیر آرام کے بعد ہمیں آگے روانہ ہونا تھا۔ہماری اگلی منزل بیرن گلی تھی۔ بیرن گلی ٹھنڈیانی سے نتھیا گلی کے درمیان ایک گاؤں کا نام ہے۔ٹھنڈیانی سے بیرن گلی تک کوئی چار گھنٹے کا پیدل سفر ہے جو تمام کا تمام گھنے جنگلات ہر مشتمل ہے۔ بیرن گلی تک اس راستے میں چڑھائی بہت کم ہے۔آغاز کے تین گھنٹے پہاڑی موڑوں پر مشتمل ڈھلوانی راستہ ہے جس میں دھوپ کا راستہ گھنے درخت روکتے ہیں۔کثرت سے بارش کے باعث اس تمام علاقے میں نمی رہتی ہے اور بے شمار اقسام کی گھاس اور خودرو جڑی بوٹیاں گھنے جنگلات میں پائی جاتی ہیں۔

کھانے اور آرام کے بعد ہم نے سامان اٹھایا اور ٹھنڈیانی کے فارسٹ ریسٹ ہاؤس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک ڈھلوان تک پہنچے۔ڈھلوان اتر کر کوئی دس منٹ میں ہم مری سے ایبٹ آباد آنے والی سڑک کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں سے سڑک پار کر کے سامنے وہ راستہ تھا جو بیرن گلی سے ہوتا ہوا نتھیا گلی تک جاتا ہے۔اس راستے پر کچھ دیر چلنے کے بعد جنگل میں سانس لینے کے لئے ہم ادھر ادھر پتھروں پر بیٹھ گئے۔جھینگروں کی سیٹیوں اور پرندوں کی گنگناہٹ دیودار کے اس جنگل میں اعصاب کو سکون بخش رہی تھی۔

یاسر ایک چھڑی سے زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ یکدم وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''یہ دیکھو یہ کیا چیز ہے۔''

سب ایک دم گھبرائے کہ پتا نہیں اس نے کیا دیکھ لیا ہے۔ہم اس کے پاس گئے۔ وہ چھڑی سے ایک پتھر کے پیچھے کسی چیز کو چھیڑ رہا تھا۔ یہ سانپ کا ایک مرا ہوا بچہ تھا۔سبز رنگت اور کوئی چار پانچ انچ لمبا۔

''چلو یار آگے چلتے ہیں کیا پتا کوئی بڑا سانپ نکل آئے کہیں سے۔''

اپنے رک سیک اٹھائے تیزی سے اترائی اترنے کی وجہ سے جب کبھی تھکاوٹ محسوس ہوتی تو ہم کہیں دو چار منٹ رک کر پھر چل پڑتے۔ بارشوں کی کثرت کی وجہ سے ہر طرف جنگلی پودے اگ آئے تھے جس کی وجہ سے کہیں کہیں راستہ تلاش کرنے میں دقت ہوتی تھی۔ بیرن گلی اور ملحقہ آبادیوں کے لوگ اس راستے پر ہی سفر کرتے ہیں اور یہ ایک مستقل راستہ ہے اس لئے کچھ تلاش کے بعد ہم صحیح راستے پر آ جاتے اور سفر جاری رہتا۔

اب شام ڈھل رہی تھی اور گھنے جنگل میں وقت سے پہلے ہی اندھیرا محسوس ہونے لگا تھا۔سورج بھی دائیں ہاتھ کے پہاڑوں کے پیچھے تھا اور ہم مسلسل سائے میں ہی چل رہے تھے۔ایک نصف دائرے کی شکل میں سفر کرتے کرتے راستہ سیدھا ہونے لگا۔اب کہیں کہیں ہلکی چڑھائی کا سامنا بھی ہو جاتا تھا۔ پیدل سفر کے آغاز میں عموماً آپ تازہ دم ہوتے ہیں اور زیادہ فاصلہ طے کر کے کچھ دیر رکتے ہیں۔لیکن سفر کے ساتھ ساتھ آپ تھوڑا سفر کر کے زیادہ دیر ٹھہرتے ہیں۔اب ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔

یہاں سے گہرائیوں میں ایک دو گاؤں بھی دکھائی دیتے تھے۔اور توقع تھی کہ اب راستے پر بھی کچھ آبادی آئے گی۔

کچھ ہی دیر میں راستے کے ساتھ چند مکان اور دو تین مقامی آدمی چادریں لپیٹے کھڑے نظر آئے۔

قریب جا کر سلام دعا ہوئی۔

اس راستے پر مقامی لوگوں کے علاوہ عموماً محکمہ جنگلات یا جنگلی حیات سے وابستہ لوگ ہی گزرتے ہیں۔لیکن ہم چونکہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے اس لئے ان حضرات میں سے ایک بزرگ کو ہمارے اس وقت سفر کرنے پر تشویش ہوئی۔

ان کا کہنا تھا کہ محکمہ جنگلات اور وائلڈ لائف وغیرہ کے لوگ تو اپنی حفاظت اور جانوروں وغیرہ کے بارے میں مکمل معلومات رکھتے ہیں لیکن ہمیں اندھیرے سے پہلے پہلے کسی محفوظ جگہ تک پہنچ جانا چاہئے۔

ان جنگلات میں ہر طرح کے جانوروں کی موجودگی کی وجہ سے ہمیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا جا رہا تھا۔

ہمیں بتایا گیا کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ آس پاس کی آبادیوں کے گھروں سے بکریاں وغیرہ غائب ہو جاتی ہیں اور دن کے وقت بھی شیروں چیتوں کا سامنا ایک معمول ہے۔ عام طور پر یہ شیر چیتے انسانوں کو تو نقصان نہیں پہنچاتے لیکن بکریوں کے شکار پر ان کا دارومدار ہے۔ بزرگ کا کہنا تھا کہ ہم لوگوں کو اندازہ ہے کہ ان درندوں سے سامنا ہونے کی صورت میں کوئی بھی جلد بازی، خوف و ہراس کا مظاہرہ یا اپنے بچاؤ کی فوری تدبیر خطرناک ہوتی ہے۔ اس لئے ہم اپنے اوسان بحال رکھتے ہوئے کوئی ایسی حرکت نہیں کرتے جس سے ان درندوں کو کوئی خطرہ محسوس ہو۔ لیکن دوسرے لوگ خوفزدگی کے عالم میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں جس سے یہ درندے کبھی کبھار ان پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں نصیحت کی کے آپ چار لوگ ہیں اور تین چار لوگوں کے سامنے یہ جانور نہیں نکلتے بلکہ چھپ کر مشاہدہ کرتے ہیں اور کسی خطرے کو نا پا کر پرامن رہتے ہیں۔ اور اگر کبھی ان کا سامنا ہو ہی جائے تو بھی پتھر اٹھانے یا شور مچانے سے گریز کریں۔ کسی غیر معمولی صورتحال یا خطرے کو نا پا کر یہ جانور خود ہی آپ سے دور ہو جائیں گے۔

یہ معلومات یقیناً بہت کارآمد اور ضروری تھیں۔ لیکن اسی جنگل میں ایسی معلومات یقیناً رونگھٹے کھڑے کر دینے والی بھی تھیں۔

سب دوستوں کے چہروں پر اڑتی ہوائیاں اندر کے حالات بیان کرنے کے لئے کافی تھیں۔

معلومات کا شکریہ ادا کر کے اور ان مقامی حضرات سے رخصت ہو کر ہم دوبارہ بیرن گلی کے راستے پر چلنے لگے۔

اب خوفزدہ نگاہیں ہر درخت کے پیچھے، کھائیوں اور پتھروں کے پیچھے کسی شیر چیتے کو ڈھونڈتی تھیں۔ قدم قدم پر خدشہ محسوس ہوتا کہ شیر آیا کہ اب آیا۔ بہرحال اس کا یہ فائدہ ہوا کہ شدید تھکاوٹ کے باوجود بھی اب کہیں رکنے اور بیٹھنے کی ہمت نا ہوتی جس کی وجہ سے راستہ تیزی سے طے ہونے لگا۔

گاؤں سے کچھ فاصلے پر جا کر ہم رکے۔

رکنے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں گاؤں کے دو تین لڑکے پتھر اٹھا اٹھا کر درختوں پر مار رہے تھے۔ قریب جا کر دیکھا تو ان کا نشانہ ایک خاصا اونچا دیودار کا درخت تھا۔ پتھر درخت کی شاخوں اور کبھی تنے سے ٹکرا کر نیچے گرتے تھے۔ کچھ سمجھ نا آئی کے ان بچوں کی اس نشانہ بازی مشق کا مقصد کیا ہے۔ پوچھا تو انہوں نے کوئی عجیب سے لفظ بولا اور کہا

کے اسے مارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

درخت پر بظاہر کسی جاندار چیز کا وجود معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بچوں کی نشاندہی پر خاصی بلندی پر تنے کے ساتھ اور شاخوں کے بیچ میں چھپنے کی کوشش کرتی ایک بلی نما چیز کو دیکھا۔ اس کا رنگ گہرا بھورا تھا اور اس وقت کے دھندلکے میں نقوش واضح نظر نہیں آتے تھے۔

بچوں کا پتھراؤ برابر جاری تھا۔ ایک پتھر اس بلی نما چیز کے قریب تنے پر لگا اور وہ ایک دم سے اڑنے لگا۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ بلی اور اڑے۔ اس کے باقاعدہ پر تھے اور اس کی مدد سے وہ چند درختوں کے فاصلے پر جا بیٹھا۔ اس کی جسامت ایک توانا بلی جتنی اور پر ایک چمگادڑ کی طرح تھے۔ ایسا کوئی جانور ہم نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا اور نا ہی ایسے کسی جانور کے بارے میں سنا تھا۔ یقیناً یہ ایک انمول جانور تھا جو عام طور پر نہیں پایا جاتا۔ اور اگر کہیں ہے بھی تو لوگوں کا نشانہ بن کر یہ نایاب جانور خاتمے کے قریب ہوگا۔

اب چلنا شروع کیا تو سورج غروب ہو چکا تھا اور جنگل میں اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اندھیرے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈ میں بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ اندھیرے کے خیال سے بیگوں سے ٹارچیں نکال کر ہم نے جیبوں میں رکھ لی تھیں۔ سب خاموش تھے اور ایک نفسیاتی خوف کی وجہ سے اعصاب تناؤ کا شکار تھے۔ جلد ہی ٹارچیں جلانا پڑیں۔

ہماری نگاہوں میں اب صرف وہ جگہ تھی جہاں ٹارچ کی روشنی پڑتی تھی۔ باقی تمام دنیا تاریک تھی۔ جنگل میں اب پرندوں کی چہچہاہٹ، ہوا کی سرسراہٹ اور ہمارے قدموں کی آوازوں کے علاوہ کسی چیز کی آواز نا آتی تھی۔ کسی درخت پر کسی پرندے کے جگہ بدلنے یا اپنی ہی ٹھوکر سے کسی پتھر کے لڑھکنے کی آواز بھی ہمیں بری طرح چونکا دیتی اور ہم ٹارچ کی روشنی ادھر ادھر مارنے لگتے۔

ہم اب جلد از جلد بیرن گلی پہنچنے کی کوشش میں تھے۔

ہمیں بتایا گیا تھا کہ بیرن گلی کے آغاز میں ایک درخت راستے کے اوپر گرا ہوا ہے۔ یہ گرا ہوا درخت اصل میں بیرن گلی کے فاریسٹ ریسٹ ہاؤس کے احاطے میں ہے لیکن چونکہ یہ ریسٹ ہاؤس راستے سے بیس تیس فٹ کی بلندی پر اور درختوں میں گھرا ہوا ہے اس لئے شاید رات کے اندھیرے میں نظر نا آئے۔ ہمارے اندازے کے مطابق اب ہم بیرن گلی کے علاقے میں ہی تھے اور کسی بھی وقت وہ درخت نظر آ جانا چاہئے تھا۔ کوئی دس منٹ میں

ہم نے وہ درخت تلاش کرلیا۔ یہاں سے ہم دائیں ہاتھ مڑ کر ایک چھوٹی سے چڑھائی چڑھے اور ٹارچوں کی مدد سے بیرن گلی کے ریسٹ ہاؤس تک پہنچ گئے۔

یہاں ہر طرف خاموشی تھی اور اب رات بھی اچھی خاصی سرد ہو چکی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے چاروں طرف خاردار تار کی باڑ تھی اور اس کا داخلی دروازہ بند تھا۔

اب سوال یہ تھا کہ کسی ڈراؤنی فلم میں دکھائے جانے کے قابل جنگل کے وسط میں واقع اس ویران وسنسان ریسٹ ہاؤس میں داخل کیسے ہوں؟

یہ ریسٹ ہاؤس ایک مختصر سے میدان کے ایک کونے میں تھا۔ میدان کے چاروں طرف درخت تھے اور جس طرف بھی ٹارچ کی روشنی جاتی درخت ہی نظر آ رہے تھے۔ آخر ہم میدان کے دوسرے کنارے کی طرف چلے تو دائیں طرف ایک کوٹھری نما مکان دکھائی دیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو کچھ دیر بعد گرم چادر لپیٹے ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ ریسٹ ہاؤس کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ یہ ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار کا مکان ہے لیکن وہ خود یہاں موجود نہیں۔ یہ صاحب چوکیدار کے بھائی تھے۔ اس نے بتایا کہ چوکیدار کسی کام سے ایبٹ آباد گیا ہے اور ایک دو دن تک آئے گا۔

ہم نے اپنا مدعا بیان کیا اور ریسٹ ہاؤس میں رات کیمپ لگانے کی بات کی تو اس نے نہایت افسوس کے ساتھ معذرت کی کہ گیٹ کی چابی تو اس کے بھائی کے پاس ہے اس لئے ریسٹ ہاؤس کھولنا اس کے لئے ممکن نہیں البتہ کھانے وغیرہ کا بندوبست وہ بخوشی کرسکتا ہے۔

اب مجبوراً ہمیں ریسٹ ہاؤس کے باہر چھوٹے میدان میں ہی کیمپ لگانا تھے۔ کیمپ لگا کر ہم اسی چھوٹے سے مکان کے ایک کمرے میں چلے گئے جہاں وہ کھانا پکانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ہم نے بمشکل اسے اس بات پر راضی کیا کہ اس وقت اور صبح کے کھانے کی ہم ادائیگی کریں گے۔ پہلے چائے تیار کی گئی اور ہم آرام سے باتیں کرنے لگے۔ راستے میں ملنے والے بزرگ کی باتیں، اندھیرے میں کئے ہوئے سفر اور خوف کا ذکر ہونے لگا۔

چوکیدار کے بھائی نے ہماری باتیں سنیں اور تصدیق کی کہ گزشتہ چند ماہ سے ان درندوں کے ہاتھوں لوگوں کا بہت نقصان ہو چکا ہے۔ اس علاقے کا کوئی فرد ایسا نہیں جس نے اپنی آنکھوں سے کئی مرتبہ کسی شیر وغیرہ کا مشاہدہ نا کیا

ہو اور راستوں تک پر آمنا سامنا ایک معمول ہے۔ بقول اس کے کسی بھی وقت کسی بھی جگہ کسی شیر کا سامنا ہو جانا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔

اس کا کہنا تھا کہ گھنے جنگلات کے عین وسط اور دور دور تک آبادیوں کے نا ہونے کی وجہ سے بیرن گلی ان درندوں کا خاص نشانہ ہے۔ اپنی خوراک کے لئے جنگل میں چرنے والے جانوروں کا غائب ہونا تو ایک طرف، رات کی تاریکی میں گھروں کی دیواریں پھلانگ کر اور کھڑکیاں وغیرہ توڑ کر بھی کوئی نا کوئی درندہ ان کے جانور نکال لیتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے گھروں کی اکثر کھڑکیاں وغیرہ لکڑی کے موٹے تختوں کی مدد سے بند کر دیئے ہیں لیکن پھر بھی ایسا ہوا کہ کسی نہایت طاقتور جانور نے چھ چھ انچ لمبی کیلوں کی مدد سے ٹھونکے گئے ان تختوں کو بھی اکھاڑ دیا۔ رات کے وقت خطرہ محسوس ہونے پر گاؤں کے لوگ ہوائی فائرنگ وغیرہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہ درندے بھاگ جاتے ہیں۔ سوائے انتہائی خطرے اور درندوں کا انسان پر حملہ آور ہونے کے محکمہ جنگلی حیات کی طرف سے ان جانوروں کو نقصان پہنچانے پر شدید پابندی ہے اور ایسا کرنے کی صورت میں سخت سزا کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ اس نے اقرار کیا کہ ان درندوں کے ہاتھوں انسانی جانوں کا نقصان نا ہونے کے برابر ہے لیکن لوگ خوف کی وجہ سے دن کے وقت بھی جنگل میں دور تک نہیں جاتے اور شام کے بعد تو بالکل ہی باہر نہیں نکلتے۔

کھانا کھانے کے بعد ہم اپنے کیمپوں میں واپس آ گئے۔

ہم دو کیمپ لے کر آئے تھے جس میں چار افراد بآسانی سو سکتے تھے۔ یہاں رات کی ٹھنڈک نا قابل برداشت تھی اور جیکٹ کے اندر بھی ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔ سلیپنگ بیگ کھولے گئے اور یاسر اور عمر ایک کیمپ میں جبکہ عنصر اور میں دوسرے کیمپ میں لیٹ گئے۔

سارے دن کی تھکاوٹ کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔

ایک عجیب سا خوف اعصاب پر سوار تھا۔ ہر کھٹکا شیر کی آمد محسوس ہوتا اور ہر سرسراہٹ کسی درندے کے قدموں کی چاپ معلوم ہوتی۔ کبھی کبھار گاؤں کے کتے بھونکتے تو گمان ہوتا کہ کسی شیر یا چیتے کو دیکھ کر بھونکے ہیں۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کے کیمپ سے سر باہر نکال کر اردگرد کا جائزہ ہی لے لے۔ دوسرے کیمپ میں یاسر اور عمر بھی غالباً اسی کیفیت سے دوچار تھے۔ عنصر تو شاید سو چکا تھا اور میری آنکھ بھی کبھی لگتی اور پھر کھل جاتی۔

عمر اور یاسر دیر تک باتیں کرتے رہے۔

''یار کہیں یہ شیر تو نہیں بھونک رہے؟''

ایک دفعہ کوئی کتا بھونکا تو عمر کی آواز سنائی دی۔ وہ شاید خوف کی کیفیت کو کم کرنے کے لئے مذاق کرنا چاہ رہا تھا۔

''نہیں، فکر مت کرو شیر بھونکا نہیں کرتے۔ جب وہ شکار پر آتے ہیں تو نہایت خاموشی سے آتے ہیں اور اپنا کام کرنے کے بعد اسی خاموشی سے غائب ہو جاتے ہیں۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی!''

یاسر نے کسی مذاق کی گنجائش ہی ختم کر دی اور اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔

کتوں اور سرسراہٹوں کی آوازوں پر کان لگائے نجانے کب آنکھ لگی۔

صبح جب آنکھ کھلی تو کیمپ خوب گرم تھا اور اس کی دیواروں سے اندر آتی روشنی دن چڑھ آنے کا پتا دے رہی تھی۔ نزدیک ہی بچوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

کیمپ کی زپ کھول کر باہر آیا تو اس چھوٹے سے میدان میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور ماحول کی خنکی کو کافی کم کر چکی تھی۔ صبح کے اس فرحت انگیز ماحول میں چاروں طرف درختوں کے بیچ سے نظر آتے آس پاس کے پہاڑوں پر گھنے درختوں کا منظر نہایت دلنشین تھا۔ چھوٹی چھوٹی گھاس سے لبریز اس میدان میں بچے ایک خود ساختہ بلے سے کرکٹ کھیل رہے تھے اور انہی کی آوازوں سے ہماری آنکھ کھلی تھی۔

جلد ہی باقی دوست بھی باہر نکل آئے۔

سوجی سرخ آنکھیں شب بیداری کی گواہی دے رہی تھیں لیکن ایک تاریک رات میں کسی شیر کی خوراک نا بننے اور دن نکل آنے کا یقین بھی سب کے چہروں پر تھا۔ یہ حقیقتاً ایک نا قابل فراموش رات تھی اور رات کی تاریکی میں طے کیا جانے والا یہ ہمارا اب تک کا سب سے باہمت سفر تھا۔

ایک بچے کو بلا کر چوکیدار کی کوٹھڑی میں بھیجا اور جگ میں پانی منگوا کر منہ ہاتھ دھوئے اور سلیپنگ بیگ دھوپ میں ڈال کر مزے سے لیٹ گئے۔

تھوڑی دیر بعد چوکیدار ناشتہ بنا لایا۔ ناشتے کے بعد سامان کی پیکنگ اور آگے کے سفر کا ارادہ کیا۔

اب دو ممبران کا نقطہ نظر یہ تھا کہ شیروں چیتوں سے لدے اس علاقے میں ٹریکنگ کوئی دانشمندی نہیں۔ یہیں سے

کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو ہمیں ایبٹ آباد یا راولپنڈی پہنچا دے۔ چوکیدار کے بھائی نے بتایا کہ یہاں سے کچھ دیر میں ایک مقامی جیپ سواریاں لے کر ایبٹ آباد جاتی ہے اور کچھ دیر میں نکل رہی ہو گی۔ آپ جانا چاہیں تو فوراً تیاری کر لیں۔ بمشکل تمام سب کو ٹریک مکمل کرنے پر آمادہ کیا اور ہمت دلائی گئی کہ آج زیادہ دیر چل کر ہم نتھیا گلی پہنچ سکتے ہیں لہٰذا اپنے ارادے کو پورا کیا جائے۔ چار لوگوں کی موجودگی میں کسی جانور کے حملہ آور ہونے کے امکانات کم ہیں اور بقول مقامی حضرات کسی خطرے کی صورت میں بھی اگر کوئی بھیانک غلطی نا کی جائے تو منزل تک پہنچا جا سکتا ہے۔

بیرن گلی سے آگے چلے تو پسینے آ گئے۔

چڑھائی بہت شدید تھی اور کافی لمبی بھی۔ پہلے تو راستہ کچھ ہموار اور چوڑا تھا لیکن آگے جا کر ایک ایسی جگہ آئی کے پتھروں کی ایک ناختم ہونے والی ڈھلوان تھی جس پر قدم قدم پر سانس پھولتا تھا۔ یہ جگہ ایک پہاڑی نالا معلوم ہوتی تھی جس میں بارشوں کا پانی کسی نامعلوم گہرائی میں جا گرتا ہو گا۔

دن کی روشنی اور آس پاس آبادی کی وجہ سے خوف کی کیفیت بہت حد تک کم ہو چکی تھی۔ پرسکون ماحول اور طرح طرح کے پرندوں کی چہچہاہٹ جو دیودار کے درختوں پر پھدکتے پھر رہے تھے۔ بائیں ہاتھ پر ایک گہری کھائی تھی جس میں درخت ہی درخت تھے اور زیادہ نیچے تک نظر نہیں جاتی تھی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد ہم اس نالے سے باہر نکلے۔ اب ہم کافی بلندی پر آ چکے تھے اور یہاں سے آگے فی الحال کوئی چڑھائی نظر نا آتی تھی۔

یہ جگہ ایک وسیع و عریض چمکدار سبز گھاس سے بھرا میدان تھا جس میں کافی فاصلے پر اکا دکا درخت نظر آ رہے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ ایسے پہاڑی علاقے میں ایسا ہموار میدان بھی ہے۔ میدان کے درمیان میں ایک پگڈنڈی واضح نظر آ رہی تھی جس پر ہم اطمینان سے چل رہے تھے۔ میدان کے دوسرے سرے پر پھر سے درختوں کا گھنا سلسلہ دکھائی دے رہا تھا اور ہم بتدریج اس کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ پگڈنڈی پر چلتے چلتے ہم درختوں میں داخل ہو گئے اور پگڈنڈی کو بائیں ہاتھ مڑتا دیکھ کر اس پر چلتے رہے۔

کچھ دیر بعد سامنے سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ قریب پہنچنے پر سلام دعا کے بعد ہم نے راستے کے بارے میں اطمینان کرنا ضروری سمجھا۔ معلوم ہوا کہ یہ راستہ تو آزاد کشمیر کی طرف جاتا ہے۔ نتھیا گلی کی طرف جانے والا راستہ

ہم کچھ پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔خوش قسمتی سے ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے اور اس جنگل میں رہنمائی کے لئے ایک انسان بھی مل گیا تھا۔ہم وہاں سے واپس مڑے۔ ہمارے رہنما نے بیرن گلی جانا تھا۔جنگل کے اندر ہی ایک جگہ رک کر اس نے ہمارے راستے کی نشاندہی کی جو گھاس وغیرہ کی وجہ سے اتنا واضح نہیں تھا۔اب ہم اس راستے پر چلے اور ہموار راستے پر چلتے ہوئے ایک اترائی کے کنارے پہنچ گئے۔

یہاں پھر سے راستہ غائب ہو رہا تھا۔

اترائی ایک ویسے ہی نالے کی صورت میں تھی جس سے ہم بیرن گلی کے بعد گزر کر آئے تھے۔اور باقی کسی بھی طرف راستے کا بظاہر کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔کچھ دیر کے شش و پنج کے بعد ہم نے نیچے جانے کا ہی فیصلہ کیا۔تیزی سے نیچے اترے اور موڑ مڑتے ہم کافی نیچے آ گئے۔ یہ راستہ بھی طویل ہوتا جا رہا تھا۔اتنے میں ایک مرد اور دو تین خواتین جو آس پاس کے کسی گاؤں کے ہوں گے، آتے دکھائی دیئے۔وہ نیچے سے اوپر آ رہے تھے۔ وہ بھی ہمیں دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کیونکہ ان راستوں پر اجنبی لوگوں کی آمد و رفت نا ہونے کے برابر ہے۔

قریب آنے پر ہم نے سلام کیا اور راستے کے بارے میں دریافت کیا۔معلوم ہوا کہ ہم ایک مرتبہ پھر غلط سمت میں جا رہے ہیں۔اصل میں جس جگہ سے ہم نیچے اترے ہیں وہیں سے بائیں ہاتھ پر وہ راستہ ہے جو ڈاک بنگلہ سے ہوتا ہوا میرا جانی کی طرف جاتا ہے۔

اب دوبارہ یہ انتہائی مشکل چڑھائی چڑھنے کی مصیبت آ پڑی۔

اترتے وقت تو آسانی اور تیزی سے ہم بہت جلدی کافی فاصلہ طے کر آئے تھے۔اب جب اوپر چڑھنا شروع کیا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا۔

اوپر پہنچتے پہنچتے تھکاوٹ سے نڈھال اور حالت سے بدحال ہو چکے تھے۔راستوں کی ان بھول بھلیوں میں ہمارا لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے الگ ضائع ہوئے۔مزید کچھ وقت آرام اور چلنے کے قابل ہونے میں لگا اور جب کچھ طبیعتیں بحال ہوئیں تو صبح سے اب تک کی چمکتی دھوپ کشمیر کی طرف سے آنے والے بادلوں کے پیچھے غائب ہونا شروع ہو چکی تھی۔

اب تک کے سفر کے بعد بھوک بھی لگ رہی تھی اس لئے وہ پراٹھے جو صبح ہی بیرن گلی ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار سے

بنوا لئے تھے نکال لئے گئے۔راستے میں کسی بھی جگہ سے کھانے یا کھانا پکانے کے بندوبست کا امکان نا ہونے کی وجہ سے یہ فیصلہ ہم نے رات کو ہی کر لیا تھا۔پانی ہم نے بوتلوں میں ساتھ رکھا ہی ہوا تھا۔

کھانا کھایا اور چل پڑے۔

یہ ایک لمبا ٹیلہ نما ہموار جگہ تھی جس پر ہم چل رہے تھے اور یہاں سے کافی فاصلے اور گہرائی میں ایک سڑک اور اس پر اکا دکا گاڑیوں کے آثار بھی نظر آتے تھے۔شاید یہ مری سے ایبٹ آباد جانے والی سڑک تھی۔تھوڑی دیر میں یہ ٹیلہ ختم ہو گیا۔اب آگے ایک دم ڈھلوان تھی اور ڈھلوان کے بعد ایک پگڈنڈی بائیں ہاتھ پر زگ زیگ ہوتی درختوں کے پیچھے غائب ہو رہی تھی۔

آسمان پر چھا جانے والے بادلوں سے اب بوندا باندی بھی شروع ہو چکی تھی اور تیز ہوا سے محسوس ہو رہا تھا کہ شاید ابھی بارش تیز ہو جائے۔تیز بارش میں دور دور تک ہمارے لئے کوئی جائے پناہ دکھائی نا دیتی تھی۔درختوں کے نیچے کسی حد تک بارش سے بچا جا سکتا تھا لیکن درختوں کی شاخوں سے ٹپکنے والے پانی سے بچاؤ کے لئے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

چلتے چلتے ہم درختوں کے ایک اور سلسلے کے قریب ہوتے چلے گئے۔

ایک طرف ایک بوڑھی خاتون لکڑیاں اکٹھی کر رہی تھیں۔سلام کیا اور فوراً راستے کے بارے میں دریافت کیا۔خوش قسمتی سے اس مرتبہ ابھی تک ہم صحیح راستے پر تھے۔ بوڑھی خاتون نے کافی آگے تک کے راستے کی نشانیاں اور سمت کا بھی بتا دیا۔معلوم ہوا کہ کوئی آدھ گھنٹہ چل کر ہم ڈاک بنگلہ ریسٹ ہاؤس تک پہنچ سکتے ہیں۔

ابھی ہم یہ معلومات لے ہی رہے تھے کہ بارش تیز ہو گئی۔سردی جو بادلوں کے چھانے کے بعد پہلے ہی کافی ہو چکی تھی اب شدید ہو گئی۔ہم نے متوقع موسم کے اندازے کے مطابق جو بھی گرم کپڑے رکھے تھے وہ پہن چکے تھے اور اب مزید کوئی بچاؤ ہمارے پاس باقی نا رہ گیا تھا۔ہم نے تیزی سے قدم اٹھانا شروع کئے۔ بارش نے چند ہی منٹ میں ہمیں ٹھنڈا ٹھار کر ڈالا تھا۔اب ہمارے پاس کہیں رکنے اور بیٹھنے کا موقع بھی نہیں تھا اور ٹھنڈ سے بچنے کے لئے چلنا ہی واحد صورت تھی۔

اصل امتحان اس وقت شروع ہوا جب پانی کے قطروں کے ساتھ باریک باریک سفید ذرات بھی ہوا میں اڑتے نظر

آنے لگے۔

اپریل کا مہینہ اور برف باری!!!

یہ تو کسی کے بھی وہم وگمان میں بھی نا تھا۔

رفتہ رفتہ برف کے یہ سفید ذرات بڑے ہونا شروع ہوئے اور زیادہ دیر نا ہوئی تھی کہ آسمان سے پانی کم اور برف زیادہ برسنے لگی۔ سبز زمین اب سفیدی مائل ہونا شروع ہوئی اور کچے راستے پر بھی پیر پھسلنے لگے۔ سفر جاری رکھنا مجبوری تھی۔ درختوں کے نیچے برف باری کی زد سے تو ہم نکل آئے لیکن درختوں سے ٹپکنے والا پانی تو پھر بھی تھا۔

کسی نا کسی طرح یہ سب سہتے اور کچھ کانپے اور کچھ ہانپتے ایک موڑ آیا اور درختوں میں گھری ایک عمارت کے آثار دکھائی دیئے۔ لکڑی اور ٹین کی ترچھی چھت اور پتھر کی دیواریں۔ یہ ڈاک بنگلہ ہی ہوسکتا تھا۔ جلد ہی ہم بنگلے میں داخل ہوئے جہاں دو تین آدمی موجود تھے۔ ڈاک بنگلے کے برآمدے میں چھت کے نیچے پہنچ کر کچھ آسودگی محسوس ہوئی۔ برف باری بھی اتنی دیر میں کم ہو چکی تھی۔ ہم نے فوراً مشورہ کیا کہ اگر برف باری اور بارش نہیں تھمتی تو ڈاک بنگلے کے ملازمین سے ایک رات ٹھہرنے کی بات کی جائے۔ یہ ریسٹ ہاؤس بیرن گلی ریسٹ ہاؤس سے بھی زیادہ پراسرار تھا۔ بیرن گلی کے آس پاس تو پھر بھی آبادی تھی۔ یہاں سے قریب ترین آبادی بھی ایک طرف بیرن گلی اور دوسری طرف نجانے کتنے فاصلے پر نتھیا گلی کا علاقہ ہوگا۔

آج اب تک کا تمام دن ہم نے جنگل اور آبادی سے دور ویران راستوں پر ہی سفر کیا تھا۔ لیکن کسی خونخوار جانور کا کہیں شائبہ تک بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ اگر مقامی لوگوں کی داستانیں سچ بھی تھیں تو یقیناً یہ جانور انسانوں کا سامنا کرنے سے گریز ہی کرتے ہیں۔ ممکن ہے کسی گمنام گوشے سے ہم بھی کسی شیر، چیتے یا گلدار وغیرہ کی نگاہوں کا نشانہ رہے ہوں لیکن ہمیں کسی بھی موقع پر کسی خطرناک صورتحال کا سامنا نہیں ہوا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بارش اور برف باری کا سلسلہ مکمل طور پر رک گیا۔ گو آسمان پر ابھی بادل تھے لیکن ڈاک بنگلہ کے ملازمین کا کہنا تھا کہ ویسے تو موسم بدلنے کی کوئی پیشگوئی نہیں کی جاسکتی، لیکن ان دنوں میں اس سے زیادہ بارش نہیں ہوا کرتی اور اس اچانک برف باری کا امکان تو انہیں بھی نہیں تھا۔

موسم کے بہتر ہوجانے پر ہم نے دوبارہ چلنے کا ارادہ کرلیا۔

جب ہم ڈاک بنگلہ سے نکلے تو شام کا آغاز ہو چکا تھا۔ جنگل میں جو علاقے بہت گھنے تھے وہاں زیادہ اندھیرا محسوس ہوتا تھا۔

اب ہم ایک پہاڑ کی ڈھلوان پر ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ بائیں ہاتھ پر یہ ڈھلوان ایک گہری کھائی کی شکل میں تھی جو مسلسل تھی۔ بارش کی وجہ سے تمام گھاس اور زمین گیلی تھی جس کی وجہ سے پھسلن بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ ڈر تھا کہ پیر پھسلنے سے کھائی میں نا جا گریں۔

کچھ دیر میں راستے پر برف کا آغاز ہوگیا۔

یہ سرویوں کے موسم کی برف تھی جو لگ بھگ سو میٹر تک راستے کے اوپر اور ارد گرد ابھی تک جمی ہوئی تھی۔ کہیں یہ اتنی کچی تھی کہ پیر اس میں دھنستے تھے اور کہیں ایسی سخت کہ پاؤں جمانا مشکل ہوتا تھا اور بار بار پھسلتے تھے۔ بہت احتیاط کے ساتھ یہ جگہ پار کی۔ برف سے گزر کر ایک موڑ کے بعد ایک مسلسل چڑھائی کا آغاز ہوا۔ کہیں چڑھائی کم اور کہیں زیادہ تھی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ اب ہم میرا جانی کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں اور یہ چڑھائی میرا جانی کی چوٹی پر جا کر ہی ختم ہوگی۔

اب ہم ایک خاصے وسیع علاقے میں تھے جس کے درمیان یہ پگڈنڈی تھی اور ہم آہستہ آہستہ میرا جانی کی چوٹی کی طرف چل رہے تھے۔ یہاں درختوں کی تعداد بھی بہت کم تھی اور نظریں کافی دور تک کا علاقہ دیکھ سکتی تھیں۔ سورج غروب ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے ہم نے پہاڑ کی چوٹی پر ایک کمرہ نما چار دیواری اور ایک کھمبا لگا دیکھا۔

یہ میرا جانی کی چوٹی تھی۔

تھکاوٹ اب مزید چلنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ لیکن ہم نے کسی نا کسی طرح نتھیا گلی پہنچنا تھا۔ اب راستے میں کسی بھی جگہ کیمپ لگانے کی توقع نہیں ہوسکتی تھی۔ میرا جانی کی چوٹی پر پہنچ کر ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔ یہاں سے ہر طرف منظر قابل دید تھا۔ گو موسم کافی حد تک بہتر ہو چکا تھا لیکن آسمان پر کہیں کہیں بادلوں اور باقی اطراف میں ہلکی سی دھند کے باعث زیادہ دور تک کا منظر واضح دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن پھر بھی جو منظر میرا جانی کی انتیس سو میٹر سے زیادہ کی بلندیوں سے دکھائی دیتا تھا وہ بھی اتنا خوش کن تھا کہ تھکاوٹ کے اثرات کو بہت حد تک کم کر رہا تھا۔ ہر طرف سرسبز درختوں میں ڈھکی ڈھلوانیں۔ مختلف پہاڑی سلسلے جو لہروں کی طرح کہیں دور سے شروع ہو کر آس

پاس کی کسی بلندی کے پیچھے گم ہو رہے تھے۔آسمان پر شفق کی سرخی اور میرا جانی کی سبز گھاس سے مزین مخملیں زمین۔

ہم نے سنا تھا کہ موسم صاف ہو تو یہاں سے کشمیر کی وادیوں سے گزرتا دریائے جہلم، کاغان کے برف پوش پہاڑ، نانگا پربت اور کوہستان کے علاقے تک دکھائی دیتے ہیں۔موسم صاف نا ہونے کی وجہ سے یہ سب تو ہم نا دیکھ سکے،لیکن مری اور گلیات کا بیشتر علاقہ اپنی وسعتوں اور سحر انگیز حسن کے ساتھ ہمارے سامنے تھا۔اور شاید میرا جانی کی اس بلندی کے علاوہ اتنا وسیع علاقہ کسی بھی اور جگہ سے دکھائی نہیں دیتا ہوگا۔

اب ہم جس راستے پر چل رہے تھے وہ میرا جانی کی دوسری طرف تیزی سے نیچے اتر رہا تھا جس کے اختتام پر ہم نے نتھیا گلی پہنچنا تھا۔

ڈھلوان کے باعث اب ہمارے قدم ناچاہتے ہوئے بھی تیزی سے اٹھتے تھے۔درختوں کا وہ سلسلہ جو زیادہ بلندی کی وجہ سے میرا جانی کی چوٹی پر نہیں تھا،اب دوبارہ شروع ہو چکا تھا اور سورج غروب ہونے کے بعد اس جنگل میں ہم ٹارچ کی روشنی میں چل رہے تھے۔کل کی رات کا خوف،دن کی روشنی ختم ہوتے ہی دوبارہ ہم پر سوار ہو چکا تھا اور ہم خاموشی سے اردگرد کی آہٹوں پر کان جمائے تیزی سے اپنی منزل تک پہنچنا چاہتے تھے۔

ہم ایک قطار کی صورت میں چل رہے تھے اور وقتاً فوقتاً راستے کے اطراف اور درختوں کے پیچھے ٹارچ کی روشنی میں اپنی تسلی کر لیتے تھے۔بیرن گلی میں جس یقین اور تواتر کے ساتھ ہمیں شیروں کی داستانیں سنائی گئی تھیں اس کے بعد ہمیں بھی محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی نا کسی شیر سے سامنا کئے بغیر شاید نتھیا گلی نا پہنچ سکیں گے۔دن کی روشنی میں تو ایسا کوئی واقع پیش نا آیا تھا اور اگر کسی شیر یا چیتے نے کسی درخت کی اوٹ یا پتھر کی آڑ سے ہمارا مشاہدہ کیا بھی ہو تو یقیناً انہوں نے ہمیں مسترد کر دیا ہوگا اور کسی بکری یا بھیڑ وغیرہ کی تلاش میں اپنی راہ لی ہوگی۔لیکن ہمیں اب بھی خدشہ تھا کہ ممکن ہے ظہرانے میں ان کا موڈ کچھ اور رہا ہو لیکن عشائیے کے لئے وہ اپنی گلی سے گزرتے چند شکاروں میں سے ہی کسی کا انتخاب کر ڈالیں۔

ڈاک بنگلہ کے بعد سے اب تک ہمیں کوئی بھی انسان نظر نہیں آیا تھا۔لیکن یہ بھی ہماری خوش قسمتی تھی کہ راستہ واضح تھا اور ڈاک بنگلہ میں موجود لوگوں نے ہمیں بہت تفصیل کے ساتھ راستے کی تمام نشانیاں بتائی تھیں۔

لگ بھگ ایک گھنٹے کی مسلسل اترائی کے بعد ہمیں درختوں میں سے چھن چھن کر آتی اکا دکا گاڑیوں کی روشنیاں نظر آئیں تو جان میں جان آئی۔غالباً یہ نتھیا گلی کی سڑک تھی جس پر گاڑیوں کی آمد و رفت تھی۔تیز تیز قدم اٹھاتے ہم چند منٹ میں اس سیاہ سڑک پر پہنچ گئے جو یقیناً نتھیا گلی کی طرف ہی جاتی تھی۔

یہاں گھپ اندھیرا تھا اور کافی فاصلے پر دائیں اور بائیں اکا دکا بلب درختوں کے پیچھے کسی آبادی کا پتہ دیتے تھے۔ہمیں یہ اندازہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ نتھیا گلی کا بازار کسی سمت میں ہے جہاں ہم کسی قیام گاہ تک پہنچیں۔کافی دیر کھڑے رہنے کے باوجود کوئی گاڑی وغیرہ بھی نا آئی تو ہم بائیں ہاتھ پر سڑک کے عین بیچ و بیچ چل پڑے۔اب ہمارے دائیں جانب گھنا جنگل اور بائیں ہاتھ پر ایک بلند دیوار تھی۔کچھ آگے جا کر ایک دم چڑھائی آئی اور ایک پختہ ہموار سڑک کی اس چڑھائی نے ہمارے پسینے نکلوا دیئے۔چڑھائی کے اختتام پر کچھ روشنی نظر آنے پر ہم دائیں ہاتھ مڑے اور چند منٹ میں نتھیا گلی کے بازار میں پہنچے جو اس وقت سنسان پڑا تھا۔

دوکانیں بند اور سڑک خالی۔

ایک دو منزلہ ہوٹل میں کچھ لوگ نظر آئے تو ہم فوراً ادھر گھس گئے۔خوش قسمتی سے کمرے بھی مل گئے اور کھانے کا بندوبست بھی تھا۔

ہوٹل کے مالک ایک خان صاحب تھے جو ہمارے تھکی ماندی حالت سے زیادہ اس بات پر متجسس تھے کہ رات کے اس وقت کون سی گاڑی ہمیں کہاں سے نتھیا گلی پہنچا گئی ہے۔

ہماری مختصر کتھا سننے کے بعد انہوں نے کانوں کا ہاتھ لگایا اور یکدم جوش سے میز پر ہاتھ مارا

''یارا آپ ادھر میرا جانی سے رات کو ادھر کیسے نکل آیا؟ رات ادھر سڑک پر ایک ٹرک والے نے شیر کو ٹکر مارا اور صبح ہم دیکھنے گیا۔وہ شیر ایک بیل سے بھی بڑا تھا۔آپ ادھر سے کیسے آیا؟ میرا جانی تو شیروں کا گھر ہے!''

ہوپر

نگر میں واقع یہ گلیشیر راس حیثیت سے منفرد ہے کہ یہ دنیا کا سب سے کم بلند گلیشیر ہے اور 2400 میٹر کی بلندی پر قائم ہے۔ اپنے ماخذ راکاپوشی سلسلے کی ایک چوٹی دیران پیک سے شروع ہونے والا یہ گلیشیر ہوپر نامی گاؤں میں آ کر ختم ہوتا ہے۔

گلگت بلتستان کا ذکر یہاں کی عظیم برفوں کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ قراقرم، ہمالیہ، ہندوکش اور پامیر کے پہاڑی سلسلوں میں جہاں لاتعداد سربفلک پہاڑی چوٹیاں، منفرد ترین جنگلی حیوانات، تیز رفتار و پرشور دریا اور حسین جنگلات و سبزہ زار ہیں وہاں دنیا کے طویل ترین گلیشیئر بھی یہاں کی انفرادیت اور شہرت کا بڑا سبب ہیں۔ سیاچن، بیافو، بالتورو، بتورہ، ہسپر اور چوگولنگما وہ نام ہیں جو قطبی علاقوں کے برفانی خطے کے بعد دنیا میں برف کے سب سے بڑے ذخائر ہیں۔ بہت سے دیگر گلیشیر بھی پاکستان اور شمالی علاقہ جات کے مختلف حصوں میں واقع ہیں اور یا تو ان گلیشئرز میں ملتے ہیں یا دیگر اطراف میں واقع ہیں۔ یہ تمام گلیشیر سلسلہ کوہ قراقرم اور پاکستان میں واقع ہیں۔ ان گلیشیرز کے اطراف موجود برفانی چوٹیاں بھی اسی طرح اپنی بلندی اور خطرناکی کی وجہ سے تمام دنیا میں بے نظیر مانی جاتی ہیں اور مجموعی طور پر یہ علاقے 'پہاڑوں کی سلطنت' اور 'پہاڑ، پہاڑوں کے دیوتا' کہلاتے ہیں۔

عام طور پر کسی بھی گلیشیر کی موجودگی کے لئے تمام سال ٹھنڈک کا ہونا ضروری ہے اور یہ یقینی طور پر نہایت بلندی کی وجہ سے ہی ممکن ہے۔ عمومی طور پر گلیشیر 4 سے 5 ہزار میٹر کی بلندی پر کسی پہاڑی چوٹی کی بنیادوں سے شروع ہوتے ہیں اور 3000 میٹر کی بلندی تک ختم ہوجاتے ہیں۔ لیکن گلگت کے ضلع نگر میں واقع ہوپر گلیشئر اس حیثیت سے منفرد ہے کہ یہ دنیا کا کم بلند ترین گلیشیر ہے اور 2400 میٹر کی بلندی پر قائم ہے۔ اپنے ماخذ راکاپوشی سلسلے کی ایک چوٹی دیران پیک سے شروع ہونے والا یہ گلیشیر ہوپر نامی اس گاؤں میں آ کر ختم ہوتا ہے۔ ہوپر گلیشیر کو 'بالتر گلیشیر' بھی کہا جاتا ہے اور ان دونوں ناموں سے مشہور ہے۔ دیران پیک کے علاوہ اس گلیشیر کے اطراف میں کیپل ڈوم، شلتر اور متعدد دیگر چوٹیاں بھی ہیں جو یہاں کی خوبصورتی اور شہرت کا سبب ہیں۔

ہوپر میں داخل ہوکر آپ ہرگز یہ اندازہ نہیں لگا سکیں گے کہ آس پاس کوئی گلیشیر بھی موجود ہے اور اگر ہے تو کس طرف ہے جب تک آپ کو بتایا نہ جائے اور آپ خود دیکھ نہ لیں۔ گاؤں کے آخری سرے پر ایک بلند ٹیلے یا نزدیکی پہاڑی پر جا کر گلیشیر کا مشاہدہ کرنا ایک ایسا دلچسپ، حیرت انگیز اور اچھوتا تجربہ ہے جسے کسی ایک جملے میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ گلیشیر کی سطح سے وقفے وقفے سے ابھرنے والی آوازیں جو یہاں کے پرسکوت ماحول میں واضح سنائی دیتی ہیں، برف کے نیچے بہنے والے پانی کی آواز، کسی پگھلتے ہوئے حصے پر پڑے چھوٹے بڑے پتھروں کا اچانک لڑھکنا اور کسی تاریک تہہ میں غائب ہوجانا۔ حیرت ہی حیرت، کائنات کے کھلتے ہوئے اسرار! نئے

ابھرتے ہوئے سوالات اور ذہن کو وسعت دینے والے مناظر جو ہر دفعہ دیکھنے پر کوئی نیا ہی رنگ لئے ہوں گے!
گلیشئر کی سطح پر چلتی ہوئی نگاہ بل کھاتے گلیشئر کے ساتھ چوٹی تک جاتی ہے، اگر چوٹی بادلوں میں چھپی نہ ہو تو۔
' کبھی عیاں کبھی نہاں' چوٹیوں کا معاملہ تو ایسا ہی ہے۔

ہو پر ایک گول وسیع ہموار وادی کی شکل میں جس کے اطراف بلند پہاڑی چوٹیاں ہیں، سرسبز فصلوں کی موجودگی میں ایک حسین پہاڑی گاؤں ہے۔ یہ ایک ایسے خطہ میں واقع ہے جہاں ہو پر گلیشیر کے علاوہ بھی متعدد گلیشیر واقع ہیں اور اسی لئے یہاں کا موسم گرمیوں میں بھی خنکی سے لبریز ہوتا ہے۔ ان علاقوں میں گرمیوں کا موسم ایسا ہوتا ہے کہ سائے میں ہوں تو دھوپ کی خواہش ہوتی ہے اور اگر دھوپ میں ہوں تو سائے کی۔ آسان الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ دھوپ نہ ہو تو ٹھنڈ ہوتی ہے۔

یہاں کے لوگ مہمان نواز اور سادہ ہیں اور زیادہ تر کاشت کاری، مویشیوں کی نگہداشت اور سیاحت کے پیشوں سے منسلک ہیں۔ گرمیوں میں یہ لوگ دیگر علاقوں کی طرح بلندی پر واقع چراہ گاہوں اور سبزہ زاروں میں اپنے جانوروں کو لے جاتے ہیں اور وہیں پر ان سے دودھ اور گوشت وغیرہ حاصل کر کے سردیوں کے موسم اور روزمرہ ضروریات کی تکمیل کے لئے جمع کرتے ہیں۔

بلند چراگاہوں میں جہاں ان حیوانات کو وافر چارہ اور سازگار ماحول میسر آتا ہے وہیں چند خطرات بھی ان کی زندگی کو لاحق رہتے ہیں۔ برفانی چیتا جو برفانی چوٹیوں اور ناقابل پہنچ مقامات پر رہتے ہیں اپنی خوراک کے لئے ان بھیڑ بکریوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ مقامی لوگوں کو ان چیتوں سے بہت شکایت رہتی ہے۔ اصل میں یہ چیتے گوشت کم اور خون کے زیادہ شوقین ہیں اور اپنی پیاس بجھانے کے لئے ایک آدھ بھیڑ بکری کے بجائے کئی کئی جانوروں کو بیک وقت ختم کر ڈالتے ہیں۔ اس وجہ سے ان جانوروں کا گوشت ضائع ہو جاتا ہے اور لوگوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ان چیتوں سے اپنے جانوروں کی حفاظت بھی آسان نہیں کیونکہ بھیڑ بکریاں سرسبز گھاس کی تلاش میں پہاڑیوں میں بکھر جاتی ہیں اور بہت بلندی پر جہاں انسان کا جانا آسان نہیں ہوتا، گھات میں بیٹھے درندوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔

ہو پر سے آگے پہاڑوں کے اندر بہت سے علاقے ہیں جو سیاحوں کے لئے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہو پر گلیشئر

سے تقریباً منسلک بر پو گلیشیر جو کئی کلومیٹر پر مشتمل ہے اور بعض دلفریب حصوں کے لئے روٹ سمجھا جاتا ہے۔ ان مقامات میں رش جھیل اور رش پہاڑی، سپانٹک پیک بیس کیمپ، میئر پیک، میئر گلیشیر اور ہمدرو غیرہ شامل ہیں۔
ان مقامات میں رش جھیل اور رش پیک ٹریک سیاحوں کے لئے غیر معمولی دلچسپی کا حامل ہے۔ یہ نسبتاً مشکل ٹریک ہو پر سے دو دن کی مسافت پر واقع ایک بلند پہاڑی 'رش' تک لے جاتا ہے جہاں ایک نہایت دلفریب جھیل واقع ہے۔ اس بلندی والے مقام کی خاص ترین بات یہ ہے کہ یہاں سے ہنزہ اور نگر کے تمام اہم مقامات اور چوٹیاں واضح دکھائی دیتی ہیں جن میں راکاپوشی، بتورہ، التر اور پسو وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کے طویل ترین گلیشئرز میں سے ایک ہسپر گلیشئر اور اس کے اطراف میں موجود دنیا کی مشہور اور بلند ترین چوٹیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ان چوٹیوں میں دستگیل سر، کنجوت سر، کنیا نگ کش وغیرہ دنیا کی بلند اور مشہور چوٹیوں میں سے ہیں۔ اس کے علاوہ ہسپر گلیشیر اپنی پچاس کلومیٹر تک طوالت اور ہیبت کے ساتھ ایک منفرد نظارہ پیش کرتا ہے۔

ہو پر سے بر پو گلیشئر کے ساتھ ساتھ ایک ٹریک پر یہ گلیشیر سفید چمکدار برف اور اطراف میں سرسبز چراہ گاہوں کے ساتھ ایک پرسکون اور خوشگوار سفر کا منفرد موقع فراہم کرتا ہے۔ یہاں کی چراہ گاہوں میں گرمیوں کا موسم گزارنے کے لئے وقتی طور پر بنائے گئے گھروں میں مقامی لوگ روایتی مہمان نوازی اور خلوص کے ساتھ سیاحوں کی تواضع کرتے ہیں۔

سیاحوں کو بلندیوں تک پہنچانے والے

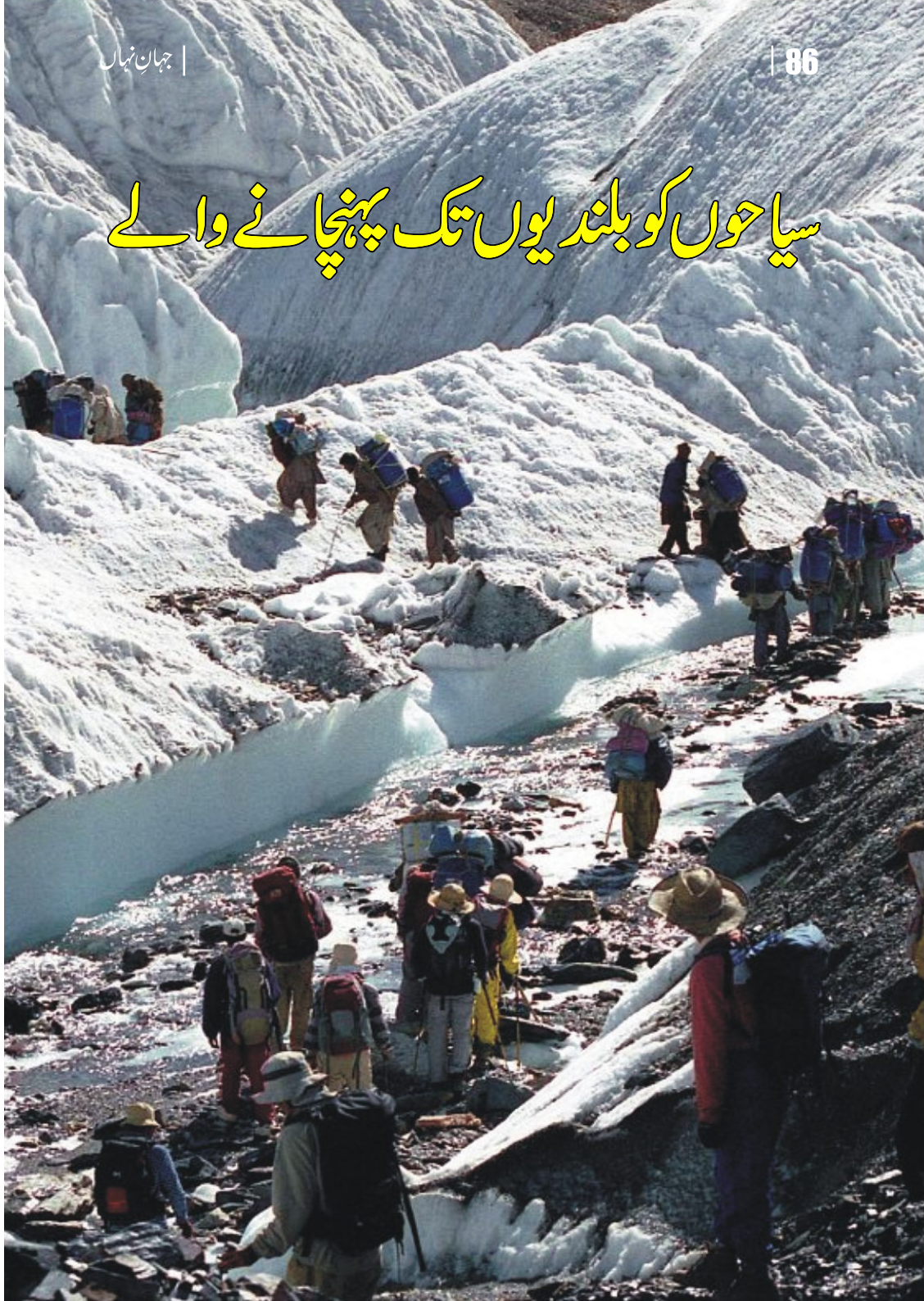

وطن عزیز پاکستان کے جفاکش باشندے، ہنرمند اور کاریگر ذریعہ معاش کے سلسلے میں انتہائی دقت طلب اور بامشقت خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ کہیں کسان زمین کے سینے سے سونے جیسی فصلوں کی پیداوار سے کروڑوں افراد کی غذائی ضروریات پورا کر رہے ہیں تو کہیں صنعتی وتعمیراتی مزدور انواع وقسام کی گھریلو دفتری ضروریات کی مصنوعات اور تعمیرات کو پایہ تکمیل تک پہنچا رہے ہیں۔ محنت ومشقت کے اس تذکرے میں ایک انتہائی دلچسپ لیکن نظروں سے اوجھل باب ان ناقابل یقین جفاکشوں کا بھی ہے جو گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں لیکن ناخواندگی، پسماندگی اور شہروں سے دوری کے باعث اپنے ہم وطنوں کے لئے اجنبی ہیں۔ یہ جفا کش انتہائی سرد اور دشوار گزار پہاڑی علاقوں جہاں بلند پہاڑوں کی آڑ میں جنت نظیر وادیاں اور برف پوش بلندیاں واقع ہیں، اپنی جرات ومحنت سے بے شمار سیاحوں، کوہ پیماؤں اور تحقیقاتی اداروں کو کامیابی سے ہمکنار کر چکے ہیں۔ اپنی جان کی بازی لگا کر کئی ملکی وغیر ملکی افراد کو بحفاظت موت کے منہ سے نکالنے والے یہ گائیڈ اور پورٹر ہزاروں پوشیدہ داستانوں کے گواہ ہیں۔

بلتستان، گلگت، چترال، چلاس، سوات، کاغان، ہنزہ اور نگر پاکستان کی سیاحت کے حوالے سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انتہائی بلند وبالا اور جنت نظیر ان علاقوں میں آنے والے سیاح بہتر سے بہترین اور بلند سے بلند ترین کی خواہش میں کئی کئی ماہ ایسے مقامات پر بسر کرتے ہیں جہاں آبادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ برفوں، پتھروں، چٹانوں اور سرد پانیوں سے لبریز ان علاقوں میں واقع دنیا کے انوکھے عجائبات کو دیکھنے اور انہیں فتح کرنے کی تمنا بے شمار غیر ملکیوں کو ہر سال گرمیوں کے موسم میں پاکستان کھینچ لاتی ہے۔

گلگت، سکردو، ہنزہ اور چترال وغیرہ کے بازاروں میں پہنچ کر ان سیاحوں اور کوہ پیماؤں کی پہلی ضرورت ایسے افراد ہوتے ہیں جو ان کے ارادوں کی تکمیل میں ان کے ہمسفر اور معاون ہو سکیں۔ پاکستان کے ان علاقوں کے لوگ اپنی جفاکشی کے باعث وزنی سامان کے ساتھ نہایت دشوار اور بلندیوں پر جانے والے راستوں پر چند ہزار روپے کے عوض اپنے روز وشب ان مہمانوں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ دنیا کے بڑے سے بڑے کوہ پیما ہوں یا ٹریکنگ کا شوق رکھنے والے بلند پہاڑوں کے شائقین، ان ناخواندہ اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس مفلوک الحال محنت کشوں کے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار سکتے۔ دنیا کی نامور ترین پہاڑی مہمات کی کامیابی کے پیچھے ان پورٹروں اور

گائیڈوں کا جتنا اہم کردار ہوا کرتا ہے اس کے مقابلے میں یہ پہاڑی میزبان اتنی ہی گمنامی کا شکار ہیں۔

پہاڑوں کی جنت سکردو سے سات سے دس گھنٹے کی جیپ کے ذریعے مسافت پر اسکولے نام کا ایک گاؤں واقع ہے۔ وادی شگر کے نام سے نہایت مشہور بلتستان کی اس طویل و عریض وادی کے انتہائی سرے پر واقع یہ گاؤں پاکستان میں غیر ملکی سیاحوں کا سب سے بڑا مرکز کہا جاسکتا ہے۔ اس گاؤں کی اس خصوصیت کی وجہ نہ صرف اس کی اپنی خوبصورتی ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ اس کی شہرت کا سبب دنیا کے خوبصورت ترین پہاڑی مرکز کنکورڈیا اور کے ٹو پہاڑ ہیں۔ اسکولے سے کے ٹو، براڈ پیک، گشابروم، ٹرانگو ٹاورز اور بالترو، بیافو اور گونڈوگورو گلیشیئر کے اطراف میں واقع دیگر پہاڑی چوٹیوں تک کی مہماتی ٹیمیں اپنا آغاز کرتی ہیں۔ پندرہ بیس دن کے عام سیاحتی ٹوور سے لے کر کئی ماہ تک کی مہمات کے لئے اسکولے اور گردونوح کے جوان، بوڑھے اور بچے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ یہی ان کے روزگار کا ذریعہ اور مشکلات کا سہارا ہے۔ غربت، پسماندگی اور ناخواندگی کے باعث یہ لوگ یا تو گرمیوں کے موسم کا انتظار کرتے ہیں یا مویشیوں اور زراعت کے ذریعے اپنے گھرانوں کا پیٹ پالنے کی سوچ میں غرق رہتے ہیں۔ حکومت پاکستان ان گائیڈوں اور پورٹروں کے لئے ہر سال ایک مناسب معاوضہ کا تعین کرتی ہے۔ سیاحوں سے حاصل ہونے والے اس معاوضے پر یہ پورٹر کئی کئی دن گھروں سے دور رہ کر ہر طرح کے موسمی اتار چڑھاؤ، حادثات اور بیماریوں کا سامنا کرتے ہیں۔ اپنی غربت اور ناخواندگی کے باعث یہ محنت کش اپنی خوراک، لباس اور حفاظت پر خرچ کرنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ رقم اپنے گھرانوں کی پرورش اور سردیوں کے موسم میں گھروں کی مرمت اور خوراک وغیرہ کے انتظام کے لئے جمع کرنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ جدید آسائشوں سے ناواقف یہ لوگ بنیادی گزراوقات کی جستجو میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں جھانکیں تو سوچ کا ایک نیا رخ سامنے آتا ہے۔

اسکولے کے گاؤں سے تعلق رکھنے والے محمد نامی ایک پورٹر نے بتایا کہ اس کے تین بچے ہیں۔ زراعت سے بمشکل گھر کا آٹا حاصل ہوتا ہے اور اس دورافتادہ مقام پر رہنے کے لئے جہاں روزمرہ ضروریات کی چیزیں انتہائی مشکل اور مہنگے داموں ملتی ہیں اسے گرمیوں میں بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ ناخواندگی اور کسی ہنر سے ناآشنائی کے باعث محمد کسی اور کام کے ذریعے اتنی آمدنی حاصل نہیں کرسکتا جو اسے اسکولے سے کسی ملکی یا غیر ملکی مہم کا سامان اٹھا

کر چلنے سے مل سکتی ہے۔ محمد کا کہنا تھا کہ سردیوں اور بارشوں میں اس کے مکان کی چھت ٹپکتی ہے جسے وہ پتوں، ٹہنیوں اور مٹی سے مرمت کر کے کام چلاتا ہے۔ بجلی اور دیگر بنیادی ضروریات سے محروم اس گاؤں میں سردیوں کے شدید موسم میں جب تمام راستے بند ہو جاتے ہیں اور کھانے پینے تک کی اشیاء کی بندش ہو جاتی ہے تو اسے انہی گرمیوں میں اس وقت کا بندوبست کرنا ہوگا۔ بچوں کی تعلیم کے حوالے سے اس نے بتایا کہ بعض ملکی اور غیر ملکی غیر سرکاری تنظیموں کے تعاون سے چلنے والے ایک سکول میں اس نے اپنے بچوں کو داخل کروایا ہے اور کوشش کرے گا کہ اپنی استطاعت کے مطابق انہیں تعلیم دلواتا رہے۔

وادی شگر کے ایک اور دورافتادہ گاؤں چوگو سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان پورٹر عسکری نے بتایا کہ وہ سکردو میں نویں جماعت کا طالب علم ہے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنی تعلیم اور گھر کے اخراجات کے لئے وہ کام کی تلاش میں نکلا ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ کسی ایسی مہم میں اسے بوجھ اٹھانے کا کام مل جائے جو دس پندرہ دنوں میں مکمل ہوسکتی ہو۔ اپنی تعلیم اور چھٹیوں کے باعث وہ اس سے زیادہ دن کام نہیں کرسکتا۔ عسکری نے بتایا کہ اس کی کوشش ہے کہ وہ تعلیم حاصل کر کے گائیڈ یا پورٹروں کا سردار بن جائے۔ اپنے گاؤں میں تعلیم نہ حاصل کرنے کے سوال پر عسکری کا کہنا تھا کہ یہاں تعلیم کا معیار اچھا نہیں ہے اور ہائی اسکول تو یہاں ہے ہی نہیں۔ اس لئے اگر وہ اچھی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے سکردو میں ہی پڑھنا پڑے گا جہاں پانچ سو روپے مہینہ فیس کے علاوہ رہنے کے اخراجات تین چار ہزار روپے ماہانہ کے لگ بھگ ہیں۔ عسکری کا کہنا تھا کہ اسے انگریزی سیکھنے کا شوق ہے کیونکہ انگریزوں کے ساتھ کام کرنے کے لئے انگریزی کا آنا لازمی ہے۔

بلتستان کے ایک اور دسٹرکٹ گنگچھے کے گاؤں ہوشے کے ایک گائیڈ اور کک (باورچی) سخاوت نے کہا کہ اگر میں پڑھا لکھا ہوتا تو اپنی کمپنی بنا کر بڑے گروپوں کو گائیڈ کرتا۔ میں آج کک کا کام کر رہا ہوں کیوں کہ مجھے کھانا پکانا آتا ہے۔ ہمارے گاؤں ہوشے میں تعلیمی سہولیات کی ہمیشہ کمی رہی جس کی وجہ سے میں اور گاؤں کے بے شمار لوگ ان پڑھ ہیں۔ سخاوت نے بتایا کہ کنکورڈیا اور کے ٹو وغیرہ کے لئے گائیڈ کا کم سے کم میٹرک پاس ہونا ضروری ہے۔ جبکہ دوسرے علاقوں میں یہ شرط نہیں ہے اس لئے موقع ملنے پر وہ دوسرے آس پاس کے علاقوں کے لئے گائیڈ کا کام بھی کرتا ہے۔ اسکولے سے کے ٹو کے لئے زیادہ رش کی وجہ سے بہت سے لوگ یہاں مزدوری کے لئے آتے

ہیں میں بھی ایک جرمنی کے گروپ کے ساتھ کلنگ کر رہا ہوں۔

شیر علی نامی ایک مقامی جو گھوڑے کے ذریعے سامان اور سیاحوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جاتا ہے نے بتایا کہ گھوڑے کی وجہ سے اسے زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ گھوڑا انسان کی نسبت کہیں زیادہ سامان اٹھا کر کم وقت میں بلند علاقوں تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بہت سے زخمی اور زیادہ عمر کے سیاح گھوڑے کے ذریعے سفر کو ترجیح دیتے ہیں جس سے اچھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے شیر علی نے کہا کہ راستہ انتہائی خطرناک ہے جس کی وجہ سے کئی گھوڑے دریا میں یا کسی بلندی سے گر کے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ گلیشیئر پر شدید سردی کے باعث بھی گھوڑوں کی جان کو خطرہ رہتا ہے۔ شیر علی نے بتایا کہ ایک گھوڑا دو تین دفعہ بلندی تک جا اور آ کر بہت عرصے تک کام کے قابل نہیں رہتا کیوں کہ بلندیوں پر گھوڑے کی خوراک میں کمی اور شدید مشقت کی وجہ سے کمزوری ہو جاتی ہے جو بہت عرصہ آرام اور خوراک کے بعد دور ہوتی ہے۔

بلند پہاڑوں کے یہ پورٹر اور مزدور بلاشبہ سیاحت کے شعبے میں اہم ترین کردار ادا کر رہے ہیں۔ بہت سے پورٹر ایسے بھی ہیں جو کوہ پیماؤں کو آٹھ ہزار میٹر سے زیادہ بلند چوٹیوں تک ان کی ضروریات کا سامان پہنچاتے ہیں۔ ایسے پورٹروں کو ہائی آلٹی چیوڈ پورٹر کہا جاتا ہے۔ ان کا معاوضہ عام پورٹروں سے کہیں زیادہ لیکن خطرات بھی انتہائی زیادہ ہوتے ہیں۔ ایسے پورٹروں کی تعداد بھی کم نہیں جو کسی مہم کے دوران اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ انتہائی مشکل حالات میں یہ پورٹر پتھروں کی آڑ میں سرد گلیشیئروں اور زمین پر ایک ترپال یا موی چادر کے نیچے راتیں گزارتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ بچت کے لئے خوراک، لباس اور حفاظت کی مد میں دیئے جانے والے پیسوں کو ان ضروریات پر خرچ کرنے سے گریز کرتے ہیں جس کی وجہ سے بیماریوں اور حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ملکی سیاحت کی خدمت کرنے والے ان انسانوں کی تربیت اور بہتری کے لئے حکومتی سطح پر کوششوں کی اشد ضرورت ہے۔ اردو سمیت کسی بھی دوسری زبان سے ناآشنائی ان محنت کشوں کی مشکلات سے آگاہی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ابتدائی تربیت اور مناسب ماحول میں سیاحوں کے ساتھ دوستانہ رویوں کی اہمیت سے آگاہی ان پورٹروں اور سیاحوں دونوں کے بہت سے مسائل کا حل ثابت ہو سکتی ہے۔

ان پورٹروں کا ایک اپنا کلچر ہے جس میں راتوں کو گیت گانا اور دن بھر خاموشی سے سلیپروں یا پھٹے پلاسٹک کے

بوٹوں کے ساتھ چلنا شامل ہے۔ ان راستوں پر جہاں پانی اور سردی سے محفوظ انتہائی مہنگے جوتوں کے اندر بھی موسم کے اثرات محسوس ہوتے ہیں یہ پورٹر پھٹا سویٹر یا میلی جیکٹ پہنے اپنے آپ میں مگن سامنے سے آتے سیاحوں سے لاتعلق اور اپنے بھائی پورٹروں سے دعا سلام کرتے اپنے گروپ لیڈر سے اچھی ٹپ کے خیال میں مگن بغیر رکے منزل پر پہنچ کر دم لیتے ہیں۔ مہم کی کامیابی یا ناکامی سے بے نیاز اسکولے واپسی پر بسکٹ اور چائے کا شاندار کھانا انہیں نئے سرے سے وزن اٹھا کر چلنے کے لئے تیار کرتا ہے اور پھر کیمپنگ سائٹ کے دروازے پر کسی دیوار یا پتھر سے ٹیک لگائے کسی نئے گروپ کی راہ تکنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

یٹی کون؟

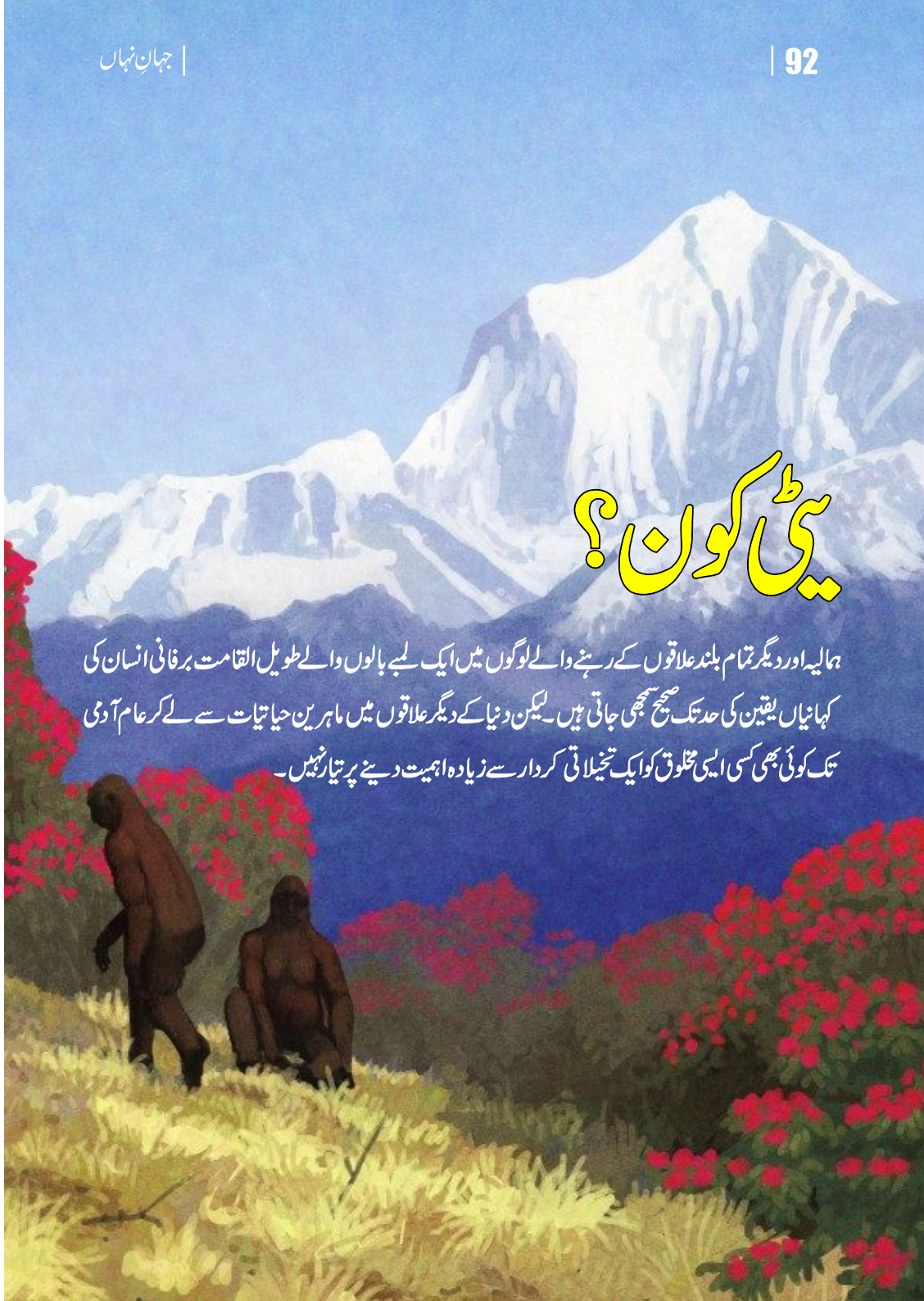

ہمالیہ اور دیگر تمام بلند علاقوں کے رہنے والے لوگوں میں ایک لمبے بالوں والے طویل القامت برفانی انسان کی کہانیاں یقین کی حد تک صحیح سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن دنیا کے دیگر علاقوں میں ماہرین حیاتیات سے لے کر عام آدمی تک کوئی بھی کسی ایسی مخلوق کو ایک تخیلاتی کردار سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہیں۔

''وہ اطمینان سے سو رہا تھا، ہم نہایت احتیاط اور خاموشی سے اس کے قریب ہوئے۔ کوئی بیس میٹر کے فاصلے پر رک کر ہم اس کا مشاہدہ کرنے لگے۔ کچھ دیر تک تو وہ سویا رہا لیکن پھر کسی آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ جوں ہی اس نے ہمیں دیکھا وہ حیران رہ گیا۔ اس کے تاثرات ایک ایسے بچے کی طرح تھے جس نے پہلی دفعہ کسی کو دیکھا ہو۔ چند منٹ وہ ہمیں حیرانگی اور بے یقینی کی کیفیت میں دیکھتا رہا اور پھر آہستگی سے اٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔''

رین ہولڈ میسنر کے 1997 میں کہے یہ الفاظ کیا کسی تخیلاتی دنیا کی داستان ہیں یا حقیقت میں اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آ سکتا ہے؟ یہ سوال بہت سے لوگوں کے مابین بحث و مباحثے اور دلچسپی کا باعث بن چکا ہے۔

قدیم دور سے لے کر اب تک ہمالیہ اور دیگر تمام بلند علاقوں کے رہنے والے لوگوں میں ایک لمبے بالوں والے طویل القامت برفانی انسان کی کہانیاں یقین کی حد تک صحیح سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن دنیا کے دیگر علاقوں میں ماہرین حیاتیات سے لے کر عام آدمی تک کوئی بھی کسی ایسی مخلوق کو ایک تخیلاتی کردار سے زیادہ اہمیت دینے پر تیار نہیں۔ اور اس سے پہلے دنیا بھر میں شہرت رکھنے والے کسی شخص نے ایسا کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا تھا۔

اٹلی سے تعلق رکھنے والے عظیم کوہ پیما رین ہولڈ میسنر دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایک نہیں کم سے کم چار مرتبہ اس مخلوق کا مشاہدہ کر چکے ہیں جسے عام طور پر یٹی کا نام دیا جاتا ہے۔ بقول میسنر ایک دفعہ وہ یٹی کے اس قدر قریب جا چکے ہیں کہ وہ اسے چھو بھی سکتے تھے۔

''یہ خاصی شرمیلی مخلوق ہے۔ اس کا قد دو میٹر کے قریب ہے اور آپس میں رابطے کے لئے یہ سیٹیوں نما آوازیں نکالتی ہے۔ رات کے اندھیروں میں اس کا نشانہ یاک اور بھیڑ بکریاں ہوتی ہیں جن کا شکار کر کے یہ گزارا کرتی ہے۔''

میسنر اپنے دعوے میں کس حد تک صحیح ہیں اس کا اندازہ ممکن ہے چند برس میں سب کو ہو جائے۔

حقیقت جو بھی ہو فی الحال یہ یقیناً ایک اچھوتا دعویٰ ہے۔ لیکن میسنر کے بارے میں بھی یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود بھی ایک غیر معمولی انسان ہیں۔ ان کے کوہ پیمائی کے ریکارڈ دیکھیں تو دور دور تک ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ وہ دنیا کے واحد انسان ہیں جنہوں نے آٹھ ہزار میٹر سے بلند دنیا کی تمام چودہ چوٹیوں کو سر کرنے کا کارنامہ انجام دے رکھا ہے۔ وہ بغیر اضافی آکسیجن کے ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کا ریکارڈ بھی رکھتے ہیں۔ انہوں نے اکیلے ماؤنٹ ایورسٹ سر کی جو آسان کام ہرگز نہیں۔ وہ ہمالیہ کے ایسے علاقوں میں بھی جا چکے ہیں جہاں شاید

بہت ہی کم لوگ پہنچ سکیں۔

''ایسی جگہوں پر جہاں کوئی درخت نہیں اگ سکتا میں دو ہفتے پورا پورا دن یٹی کی تلاش میں پھرا۔ پھر میں غیر معمولی یعنی تقریباً پینتیس سینٹی میٹر چوڑے قدموں کے نشانات کا پیچھا کرتا رہا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ ہم اتنی جلدی اسے پا لیں گے۔ پہلے میں نے ایک مادہ یٹی کو اپنے بچے کے ساتھ دیکھا۔ بچے کے بال سرخ رنگ کے تھے جبکہ اس کی ماں کے بال کالے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے ہمیں دیکھا وہ نہایت تیز رفتاری سے بھاگ کر کہیں چھپ گئے۔''

یہ بھی میسنر ہی کا کہنا ہے۔ اس کے دو دن بعد میسنر اور ان کے ساتھی ایک سوئے ہوئے یٹی تک پہنچے۔

ڈاکٹر کارل شنکر جو انگلینڈ میں ایک زووالوجسٹ ہیں اور یٹی سے متعلق معلومات اور معاملات میں ایک ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میسنر کی ان باتوں میں وزن ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

''ہمالیہ کے دو ہزار کلومیٹر رقبے میں جو زیادہ تر پاکستان، تبت اور بھارت کے علاقوں پر مشتمل ہے، یٹی کے شواہد ملتے رہے ہیں۔ ان شواہد کی بنیاد پر ان کی تین قسمیں سمجھ آتی ہیں۔ ایک سرخ یٹی، دوسرا طویل القامت کالا برفانی انسان اور تیسرا سرخی مائل چھوٹے یٹی۔''

اگر میسنر کی باتوں کو کارل شنکر کے بیان سے ملایا جائے تو یہ سمجھ آتا ہے کہ سرخ یٹی اصل میں چھوٹی عمر کے بچے کو کہا جا سکتا ہے اور بڑی عمر کے یٹی کالے بالوں والا طویل القامت یٹی ہو سکتا ہے۔ جبکہ ممکن ہے درمیانی عمر کا یٹی کچھ سرخ اور کچھ کالا ہوتا ہو۔

لیکن یٹی کی موجودگی کے بارے میں سب سے اہم اعتراض جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی بھی مخلوق خود اکیلی زندہ اور قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر اس کا کوئی وجود ہے تو یہ چند سو کی تعداد میں نا صحیح پچاس کے لگ بھگ تو کہیں اکٹھی ہوں۔ اور اگر کسی بھی مقام پر ان کی اتنی تعداد موجود ہے تو اب تک اس کا یقینی سراغ کیوں نہیں لگایا جا سکا؟

اس اعتراض کے جواب میں میسنر کا کہنا ہے کہ یہ مخلوق خطرے سے دور رہنا چاہتی ہے اور اسی لئے یہ صرف ایسے علاقوں کو اپنا مسکن بناتی ہے جہاں انسان کی پہنچ نا ہو سکے۔ ان کا اندازہ ہے کہ صرف ہمالیہ کے علاقوں میں ہی ان کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ ہے۔ ہمالیہ کے یہ علاقے برف اور جنگلات سے بھرے ہوئے ہیں۔ جہاں ایسی کسی بھی مخلوق کا زندہ ہونا عین ممکن ہے۔ یہ رات کو شکار پر نکل کر اپنا گزارا کر سکتی ہے۔ مقامی لوگوں کی طرف سے

ایسی کئی شکایات سننے میں آتی رہتی ہیں کہ ان کے جانور گم ہو گئے ہیں۔ اور گم ہونے سے مراد جانوروں کا چوری ہونا نہیں بلکہ کسی گوشت خور جانور مثلاً چیتے وغیرہ کے بھینٹ چڑھنا ہوا کرتا ہے۔

پاکستان کے شمالی اور پہاڑی علاقوں کے لوگ بھی ایسی مخلوق کی موجودگی پر یقین رکھتے ہیں۔ چند بڑے بوڑھے اپنی آنکھوں سے اس مخلوق کو دیکھنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ بعض غیر ملکی سیاحوں نے سنو لیک (بیافو اور ہسپر گلیشیئر واقع ضلع نگر) کے آس پاس بڑے بڑے قدموں کے نشانات کی گواہی دی ہے۔ ضلع دیامر میں نانگا پربت سے ملحقہ نہایت گھنے جنگلات پر مشتمل علاقے فیری میڈوز میں بھی لوگ 'بار بنڈو' نام کی کسی ایسی ہی مخلوق کی داستانیں سناتے ہیں۔ ایک مرتبہ کیلاش کی وادیوں میں اسی قسم کی ایک مخلوق دیکھی گئی جس کے متعلق بعض خبریں اخبارات میں بھی شائع ہوئیں۔

کچھ عرصہ قبل بنگلہ دیش اور بھارت کی سرحدوں پر واقع برما کے علاقے میں بھی ایسا ہی سنا گیا۔ بغور معائنے کے بعد اس مرتبہ ماہرین کچھ بال وغیرہ بھی اکھٹے کرنے میں کامیاب ہوئے اور پھر مختلف سائنسی بنیادوں پر ان بالوں وغیرہ کے ٹیسٹ نے یہ ثابت کیا کہ کم از کم یہ کسی ایسے جانور یا مخلوق کے ضرور ہیں جس سے اب تک سائنس واقف نہیں تھی۔

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اگر یہ مخلوق موجود نہیں تو مختلف مقامات کے بہت سے لوگ ایک جیسی داستانوں پر کیوں یقین رکھتے ہیں اور اگر موجود ہے تو ہر طرح کی ٹیکنالوجی اور انسانی کوششوں کے باوجود اب تک کوئی ٹھوس ثبوت سامنے کیوں نہیں آ سکا؟ اب رین ہولڈ میسنر تو عمر کے تقاضوں کی وجہ سے زیادہ بلند علاقوں تک جانے کے قابل نہیں ہیں اور پہاڑوں سے متعلق ایک جدید طرز کے میوزیم کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں۔

دیکھیں اب کون اور کب یٹی یا بار بنڈو اور ایسے ہی کئی ناموں والے کسی برفانی انسان کے راز سے پردہ اٹھاتا ہے۔ یا کوئی ماہر ہمیشہ سے سنی سنائی جانے والی ان داستانوں کے مرکزی خیال کی تردید کو ثابت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

جب تک کسی بھی ایک یقینی اور قابل قبول نتیجے پر نہیں پہنچا جاتا، 2500 میٹر سے بلند علاقوں کے بہت سے مکین اور سیاح شاید اس مخلوق کے واہمے سے نکل نا سکیں۔

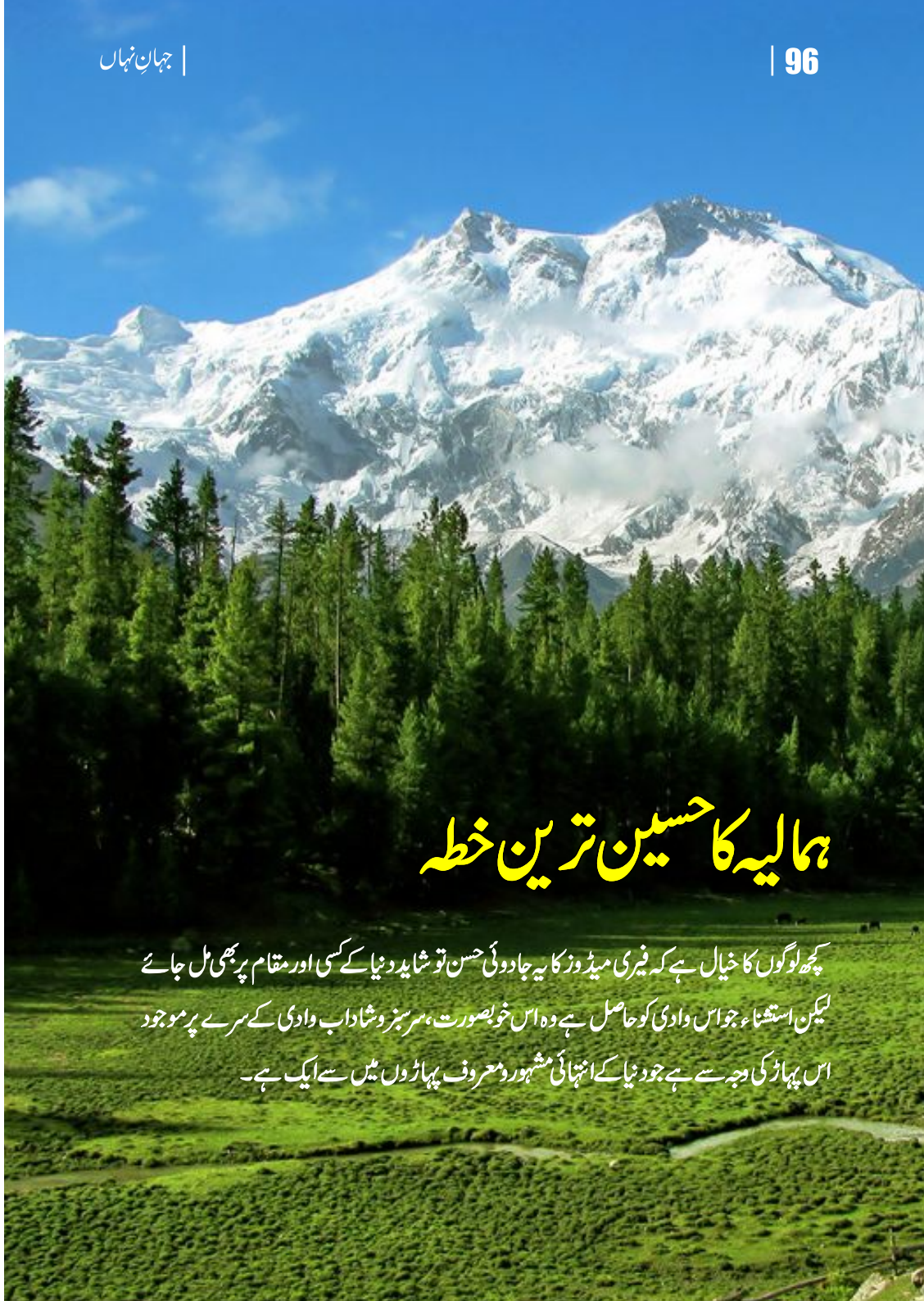

ہمالیہ کا حسین ترین خطہ

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فیری میڈوز کا یہ جادوئی حسن تو شاید دنیا کے کسی اور مقام پر بھی مل جائے لیکن استثناء جو اس وادی کو حاصل ہے وہ اس خوبصورت، سرسبز و شاداب وادی کے سرے پر موجود اس پہاڑ کی وجہ سے ہے جو دنیا کے انتہائی مشہور و معروف پہاڑوں میں سے ایک ہے۔

سرسبز گھاس سے مزین میدانوں، ہزار ہا رنگ کے پھولوں، شفاف پانی کی ندیوں اور گھنے دیودار کے جنگلات پر مشتمل ایک خطے کو اگر پریاں اپنا مسکن بنالیں تو کوئی اچھنبے کی بات نہیں!

مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ پریوں نے ہمالیہ کے اس حسین ترین خطے کو اپنی جنت کے طور پر چن رکھا ہے۔ ادبی ذوق والے انسانوں نے بھی یہاں کے قدرتی حسن سے متاثر ہو کر اس توجیہہ کو تسلیم کیا اور بالآخر یہ خوبصورت ترین جگہ 'فیری میڈوز' یعنی 'پریوں کی چراگاہوں' کے نام سے تمام دنیا میں شہرت اختیار کر گئی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فیری میڈوز کا یہ جادوئی حسن تو شاید دنیا کے کسی اور مقام پر بھی مل جائے لیکن استثناء جو اس وادی کو حاصل ہے وہ اس خوبصورت، سرسبز و شاداب وادی کے سرے پر موجود اس پہاڑ کی وجہ سے ہے جو دنیا کے انتہائی مشہور و معروف پہاڑوں میں سے ایک ہے۔

نانگا پربت برفانی چوٹیوں کا ایک سلسلہ ہے جو ایک نصف دائرے کی شکل میں فیری میڈوز کو دو اطراف سے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ 'نانگا پربت' کو جب فیری میڈوز سے دیکھا جائے تو یہ جگہ بالحقیقت دماغوں کو تسخیر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ سفید برف پوش چوٹیوں میں گھرا ہوا، تمام دن برف کی ٹھنڈک، تازہ ہواؤں اور معطر فضاؤں سے لبریز ایک جنت نظیر وادی میں کسی ٹھنڈے پانی کے چشمے کے کنارے بیٹھ کر انسان کی کیفیات کیا ہو سکتی ہیں، ہر شخص اپنے مزاج کے مطابق اس کا اندازہ بآسانی لگا سکتا ہے۔

فیری میڈوز کی اوسط بلندی 3600 میٹر ہے اور جغرافیائی لحاظ سے یہ کوہ ہمالیہ کے انتہائی مغربی کنارے پر واقع ہے۔ وفاقی دارالحکومت اسلام آباد سے 540 کلومیٹر کے فاصلے پر شاہراہ قراقرم پر واقع 'رائی کوٹ' فیری میڈوز کے لئے پختہ سڑک کا آخری سٹاپ ہے۔ رائی کوٹ، دریائے سندھ پر تعمیر کیے گئے ایک بڑے پل کی وجہ سے بھی مشہور ہے اور چلاس یا دیامر ڈسٹرکٹ کی حدود میں واقع ہے۔ رائی کوٹ سے پرائیویٹ جیپ آپ کو تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں 2900 میٹر کی بلندی پر واقع ایک گاؤں 'تتو' تک پہنچائے گی۔

رائی کوٹ موسم گرما میں ایک تنور کا منظر پیش کر رہا ہوتا ہے۔ چاروں طرف موجود پتھریلے تانبے کی رنگت کے پہاڑ اور دریائے سندھ کے کنارے موجود ریت دھوپ کی تمازت سے دہک رہی ہوتی ہے۔ رائی کوٹ سے جب جیپ پر سفر کا آغاز ہوتا ہے تو اچانک انتہائی چڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ چڑھائی ایک لامتناہی شکل میں ان گنت

موڑوں اور گہرائی میں بہنے والے دریائے رائی کوٹ سے خاصی بلندی پر آپ کے ساتھ تتو تک جاتی ہے۔ یہ راستہ ایک گرم خشک سفر پر مشتمل ہے اور مقامی لوگ جو زیادہ تر پیدل سفر کرتے ہیں صبح یا شام کے وقت اس راستے پر نکلتے ہیں۔ نانگا پربت پہاڑوں کی اوٹ سے راستے کے موڑوں پر کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے اور اگر پیچھے کی طرف نگاہ ڈالیں تو فاصلے پر راکاپوشی پہاڑ کے نظارے بھی قابل دید ہیں۔

تتو پہنچنے پر ایک تازہ اور ٹھنڈے پانی کا شفاف چشمہ سفر کے اختتام کا اعلان کرتا ہے۔ اکثر سیاح یہاں پہنچتے ہی اس چشمے پر جمع ہو جاتے ہیں اور سفر کی تھکاوٹ کو اس پر تاثیر پانی سے اتارتے ہیں۔ تتو بھی ایک پر فضا مقام ہے اور یہاں پہنچ کر تمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں لکڑی اور ٹین کے بنے ایک دو ہوٹل بھی موجود ہیں جہاں چائے اور کھانا وغیرہ دستیاب ہیں۔ کیمپنگ کی جگہ بھی تتو میں موجود ہے۔ تتو کے اس نام کی وجہ گاؤں میں موجود ایک گرم پانی کا چشمہ ہے۔ اس کے علاوہ جہاں جیپ آپ کو اتارتی ہے وہاں چشمے کے بہاؤ کے مخالف سمت یعنی اپنے دائیں جانب چشمے کے کنارے کنارے کچھ دور تک جانے پر ایک خوبصورت آبشار بھی موجود ہے جو عمومی طور پر سیاحوں کی نظروں سے اوجھل رہ جاتی ہے۔

تتو سے آگے فیری میڈوز تک آپ کو پیدل سفر کرنا ہوگا یا اگر چاہیں تو کرائے کے خچر یا گھوڑے کا بندوبست بھی ممکن ہے۔ اگر آپ کے پاس زیادہ سامان ہے تو آپ تتو گاؤں سے مناسب معاوضہ کے عوض پورٹر کا بندوبست بھی کر سکتے ہیں جو آپ کے سفر کو آسان بنانے میں مددگار ہوگا۔ تتو سے فیری میڈوز تک کا پیدل سفر بہت سے لوگوں کو خاصا دشوار محسوس ہوتا ہے۔ وجہ ایک متواتر چڑھائی ہے جو کافی دیر تک دھوپ میں اور بلندی تک طے کرنی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا صلہ اس مشقت سے بہت بڑھ کر ہے۔ اگر آپ پیدل سفر کر رہے ہیں تو اپنے ساتھ پانی کی بوتل رکھنا مت بھولیں۔ عام طور پر یہ سفر تین سے پانچ گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے لیکن نوجوان اور پیدل چلنے کے عادی افراد اس سے کم وقت میں بھی فیری میڈوز تک پہنچ سکتے ہیں۔

فیری میڈوز پہنچنے سے قریباً آدھا گھنٹہ قبل آپ کا گزر ایک گھنے جنگل میں ہوتا ہے جہاں قدم قدم پر ٹھنڈے پانی کی موجودگی اور نانگا پربت کا نظارہ آپ کو اپنی محنت کے پھل کا ہلکا سے اندازہ فراہم کرتا ہے۔ یہاں آپ کو ایک اور حیرت سے بھی واسطہ پڑتا ہے! رائی کوٹ دریا اپنے ماخذ رائی کوٹ گلیشیر سے نکلتا ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے۔

گلیشیر کا دہانہ ایک غار سے مشابہ ہے اور جن لوگوں نے گلیشیر نہیں دیکھا انھیں بہت دیر تک یقین ہی نہیں آتا کہ یہ کسی گلیشئر کا نقطہ اختتام ہے۔ سیاہ رنگ کا ایک جناتی اژدہا کئی کلومیٹر لمبائی اور چوڑائی پر مشتمل رائی کوٹ کی بلند چوٹی سے اترتا اس مقام پر دریا کی شکل میں ڈھل رہا ہے۔

فیری میڈوز میں داخل ہوتے ہی ہر طرف سبزہ و شادابی، بائیں طرف نانگا پربت اور نیچے رائی کوٹ گلیشیر آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔ فیری میڈوز میں ایک مختصر سی جھیل بھی موجود ہے۔ اس جھیل میں جب آس پاس موجود درختوں اور نانگا پربت کا عکس پڑتا ہے تو ایک ناقابل بیان قدرتی حسن کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

یہاں پر دو ہوٹل اور کیمپنگ کے لئے بہت سے خوبصورت جگہیں ہیں جو آپ اپنی پسند کے مطابق منتخب کر سکتے ہیں۔ اگر خوراک کا انتظام آپ اپنے ساتھ لائے ہیں تو خوب، بصورت دیگر یہاں خوراک آپ کو عام حالات سے کئی گنا زیادہ قیمت پر ملے گی۔ اس کی وجہ اس دشوار گزار علاقے تک سامان پہنچانے کے اخراجات ہیں۔

فیری میڈوز سے نانگا پربت بیس کیمپ تک آپ ایک دن میں جا کر واپس آ سکتے ہیں۔ اس سفر میں ایک مقامی گائیڈ بہت سی مشکلات میں آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ اس کی وجہ راستے میں آنے والے گلیشیر ہیں جو ناواقف سیاحوں کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں اور بھول بھلیاں بھی۔ فیری میڈوز سے نانگا پربت کی سمت سفر کا آغاز گھنے جنگل میں آسان اور ہموار پگڈنڈی پر ہے اور 'بیال' تک تمام راستہ نہایت پرسکون اور آسان ہے۔ یہاں سے آگے کا سفر پہلے چڑھائی پر مشتمل ہے اور پھر اترائی پر۔

اترائی کے بعد آپ کبھی گلیشیر پر چلتے ہیں تو کہیں یخ بستہ تیز رفتار پانی میں راستہ بناتے ہیں۔ گلیشیر کے اختتام پر ایک مرتبہ پھر ایک چڑھائی کا سامنا کرنا ہوتا ہے جو آپ کو کچھ ہی دیر میں نانگا پربت کے بیس کیمپ پہنچا دیتی ہے۔ یہاں سے نانگا پربت اپنی تمام تر ہیبت اور جسامت کے ساتھ آپ کے بہت قریب برفانی پہاڑ کی حقیقی تصویر بنا کھڑا ہے۔ آپ کے تین اطراف اسی سلسلے کی مزید چوٹیاں ایک دائرے کی شکل میں گھیراؤ کئے ہوتی ہیں۔ ان چوٹیوں میں چونگڑا، رائی کوٹ، جلی پور اور گونا لو شامل ہیں۔ ہر طرف چوٹیوں سے اترتے گلیشیر ایک بڑے گلیشیر میں ملتے عجیب سماں پیش کرتے ہیں۔

نانگا پربت کی اونچائی 8125 میٹر ہے۔ پاکستان میں واقع یہ دوسری جب کہ دنیا کی نویں بلند ترین چوٹی ہے۔

اس پہاڑ کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ دنیا کی مشکل ترین چوٹی ہے اور اب تک چالیس سے زائد کوہ نوردوں کی ہلاکت کا باعث بھی بن چکی ہے۔ اس خاصیت کی وجہ سے یہ 'کلر ماؤنٹین' یعنی 'قاتل پہاڑ' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ مقامی طور پر اس پہاڑ کو 'دیامر' بھی کہا جاتا ہے بلکہ آس پاس کا تمام علاقہ ہی دیامر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ نانگا پربت کے نام کی وجہ یہ ہے کہ انتہائی بلند ہونے کے باوجود اس چوٹی کی دیواروں پر برف نہیں ٹھہرتی۔

فیری میڈوز میں سیاح عموماً کئی دن رکتے ہیں اور اس جگہ کے چپے چپے میں گھوم پھر کر قدرت کی شاہکار تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جولائی کے مہینے میں مقامی لوگ یہاں ایک پولوٹورنامنٹ کا انعقاد بھی کرتے ہیں جو سیاحوں کی تفریح کو دوبالا کر دیتا ہے۔ یہاں کے جنگلات میں کئی قسم کے خوبصورت پرندے اور جانور بھی موجود ہیں جبکہ چراہ گاہوں میں چرتے ہوئے گاؤں کے پالتو جانور بھی ایک دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی مقامی زبان 'شنیا' ہے جو آس پاس کے تمام علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ لوگ نہایت مہمان نواز اور شائستہ ہیں، پالتو جانور، گرمیوں میں کھیتی باڑی اور سیاحت کا پیشہ ان لوگوں کے روزگار کے اہم ذرائع ہیں۔

HINDUKUSH
GILGIT BALTISTAN
KARAKORAM RANGE
HIMALAYA
THUI RANGE
North West Frontier Province
Chitral
Kohistan
Baltistan
Hunza
Black Mountains
Deosal Plains
Line of Control
Azad Kashmir
Punjab
Islamabad
Rawalpindi
Peshawar
Nowshera
Gilgit
Skardu
Swat
K2 8611m
Karakoram Highway (KKH)
Indus
Tarbela Reservoir
Khunjerab Pass 4934
Khunjerab National Park
Concordia
Nanga Parbat 8125
Rakaposhi
Baltoro Glacier
Batura Glacier
Shandur Pass 3735
Babusar Pass 4145
Burzil Pass 4199m
Lowari Pass 3118 m
Murree
Abbottabad
Mansehra
Muzaffarabad
Kaghan
Naran
Chilas
Astor
Hasan Abdal
Attock City
Taxila
M2

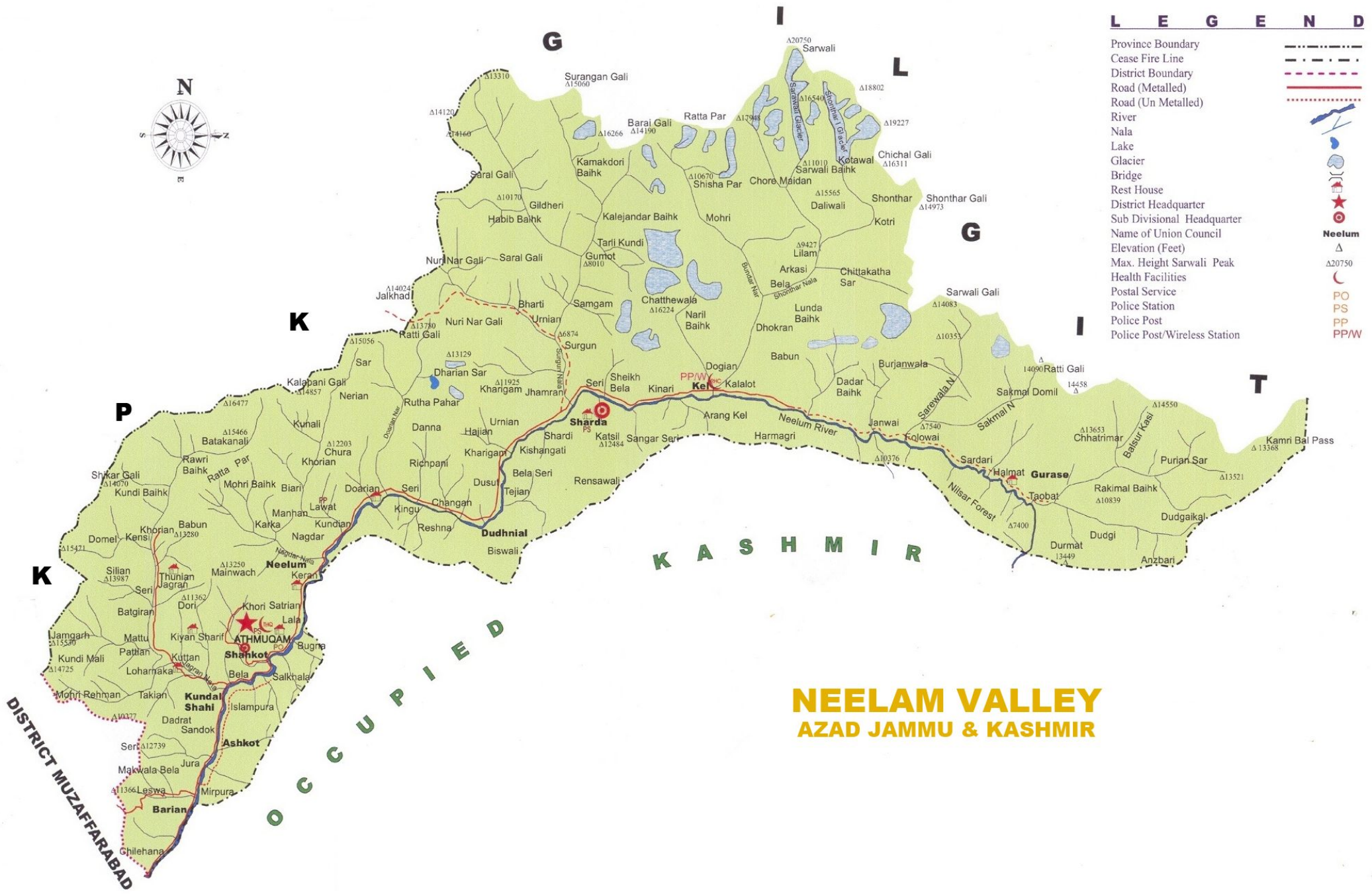

NEELAM VALLEY
AZAD JAMMU & KASHMIR

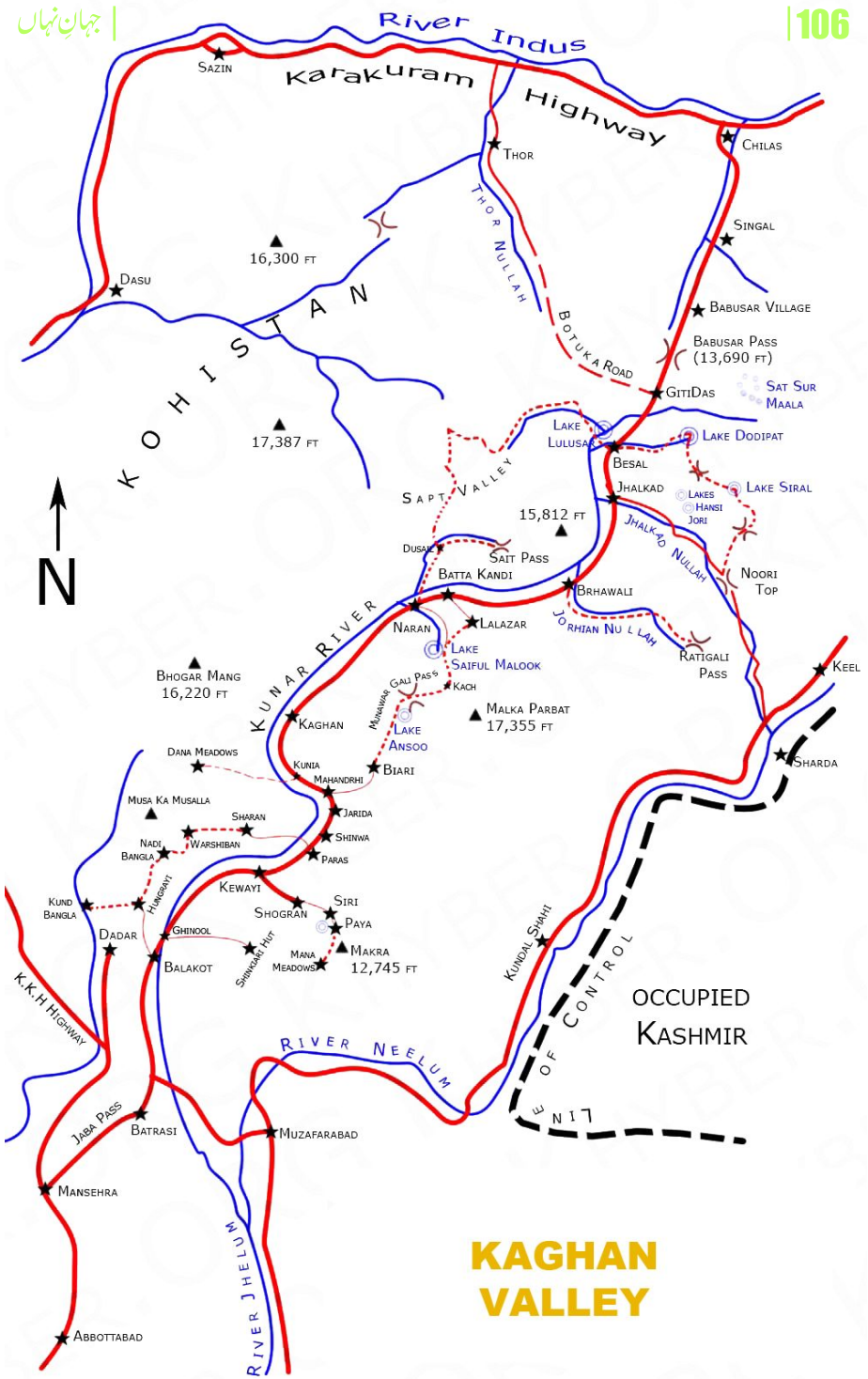

River Indus
Karakuram Highway
Sazin
Thor
Chilas
Thor Nullah
Singal
16,300 ft
Dasu
Kohistan
Babusar Village
Babusar Pass (13,690 ft)
Botuka Road
GitiDas
Sat Sur Maala
17,387 ft
Lake Lulusar
Lake Dodipat
Besal
Sapt Valley
Jhalkad
Lake Siral
Lakes Hansi Jori
15,812 ft
Jhalkad Nullah
Dusai
Sait Pass
Noori Top
N
Batta Kandi
Brhawali
Naran
Lalazar
Jorhian Nullah
Ratigali Pass
Keel
Lake Saiful Malook
Kunar River
Bhogar Mang 16,220 ft
Munawar Gali Pass
Kach
Malka Parbat 17,355 ft
Kaghan
Lake Ansoo
Sharda
Dana Meadows
Kunia
Biari
Mahandrhi
Musa Ka Musalla
Jarida
Sharan
Shinwa
Nadi Bangla
Warshiban
Paras
Kewayi
Kund Bangla
Hungrayi
Siri
Shogran
Paya
Dadar
Ghinool
Makra 12,745 ft
Shinkiari Hut
Mana Meadows
Balakot
Kundal Shahi
K.K.H Highway
Line of Control
Occupied Kashmir
River Neelum
Jaba Pass
Batrasi
Muzafarabad
Mansehra
River Jhelum
Abbottabad
KAGHAN VALLEY

جہانِ نہاں
سید محمد اطہر شہزاد
جہانِ نہاں